علی احمد فاطمی
فیض
ایک نیا مطالعہ

فیض

ایک نیا مطالعہ

علی احمد فاطمی

FAIZ -- Ek Naya Mutalia
by Prof. A. A. Fatmi

Price : Rs.200/-

طبع اوّل	:	جنوری ۲۰۱۲ء
تعداد اشاعت	:	۴۰۰
قیمت	:	۲۰۰ روپئے
مطبع	:	شارپ ٹریک، الہ آباد
سرورق	:	شاداب مسیح الزماں
ناشر	:	ادارۂ نیا سفر، الہ آباد

ملنے کے پتے:

۱۔ ادارۂ نیا سفر، ۶۸، مرزا غالب روڈ، الہ آباد

۲۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

۴۔ بک امپوریم، اردو بازار، سبزی منڈی، پٹنہ

ہند و پاک کے دو محترم و معتبر ترقی پسند دانشور

جناب ضیا الحق (الہ آباد)

اور

جناب راحت سعید (کراچی)

کے نام

ترتیب

ابتدائیہ

فیض کی تمام تر مقبولیت ومحبوبیت کے باوجود سچ یہ ہے کہ میں نے ان کے شعر و ادب کا مطالعہ اس انداز سے نہیں کیا تھا جس طرح سے جوش اور فراق کا کیا۔ اسی لیے فیض پر زیادہ لکھ بھی نہ پایا تھا۔ چند برس قبل دو ایک مضامین ضرورتاً لکھے گئے تھے کہ فیض صدی آ گئی۔ رسائل فیض نمبر نکالنے لگے۔ سیمینار و مذاکرے ہونے لگے۔ ان سب کی فرمائش پر مضامین لکھنے پڑے۔ نیویارک (امریکہ) میں عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تو پورا ایک دن فیض سے منسوب کیا گیا میں بھی مدعوعین میں سے تھا۔ غور وفکر کے ساتھ مقالہ لکھا اور فیض کی شاعری میں مارکسزم کے ساتھ ساتھ صوفی ازم کے عناصر تلاش کئے کہ فیض کی ترقی پسند شخصیت کی تعمیر میں تصوف کا بہر حال دخل ہے۔ نیویارک کے اسی فیض سیمینار میں ایک پروفیسر نے فیض کی نظم تنہائی کا تجزیہ پیش کیا جو خاصا یک رُخا تھا۔ ٹورنٹو (کینڈا) میں ہی میں نے تقی عابدی کے دولت کدے پر کئی روز کے قیام کے دوران ان کے کتب خانے سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے انداز سے تنہائی نظم پر تفصیلی تجزیہ لکھا۔ مضمون صاف ہوا کیلگری میں برادر محترم اقبال حیدر کی لائبریری میں اُنھیں دنوں اقبال حیدر نے بھی کیلگری میں فیض اور مجاز پر عالمی سیمنار کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس سیمینار کے لئے میں نے فیض اور اقبال مضمون لکھا اور پیش کیا۔ جو پسند کیا گیا۔ فیض کو پڑھتا گیا۔ مضامین ہوتے گئے۔ فیض کی غالب شناسی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے اسی درمیان روسی اسکالر لُد میلا واسی لیوا کی کتاب ''پرورش لوح وقلم فیض حیات اور تخلیقات'' اور تقی عابدی کی کتاب فیض فہمی ہاتھ لگی۔ دونوں کتابیں الگ الگ انداز کی ہیں اور اہم ہیں۔ میں نے ان دونوں پر تبصرہ نما مضامین لکھ ڈالے۔ غالب انسی ٹیوٹ، دہلی ہر سال دسمبر میں ایک عالمی سیمینار کا اہتمام کرتا ہے۔ میں نے انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری اور ممتاز ادیب و ناقد پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی سے گذارش کی کہ اس سال وہ فیض پر نہ صرف سیمینار کریں بلکہ ان کی مزاحمتی واحتجاجی شاعری

کو بطور خاص موضوع بنائیں ان کو یہ تجویز پسند آئی۔انھوں نے پورے سیمینار کا عنوان ہی رکھدیا۔ ''مزاحمت کی جمالیات اور فیض''۔مقالہ فیض جمال سے جلال تک اس سیمینار کے لئے لکھا گیا۔اس درمیان کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر جعفر احمد نے یونیورسٹی میں عالمی فیض سیمینار کا اہتمام کیا اور خاکسار کو مدعو کیا۔اس سیمینار میں اور شہر کراچی کی دیگر تقریبات میں شرکت کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ فیض صدی کے موقع پر پاکستان میں فیض کی اور فیض پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں محمد علی صدیقی،سحر انصاری،عبدالرؤف ملک،احمد سلیم، طاہر تونسوی وغیرہ کی کتابیں بیحد اہم ہیں جو شاعر فیض کے علاوہ مفکر، دانشور،صحافی،لیڈر، عوامی ثقافت کے علمبردار،مزدوروں کے رہنما اور دیگر عوامی تحریکات کے رہبر کے طور پر فیض کو پیش کرتی ہیں جن سے ہندوستان کے لوگ کماحقہ واقف نہیں____ خواہش تو یہ ہوئی کہ ان میں سے ہر کتاب پر الگ الگ مضمون لکھوں یا تبصرہ کروں لیکن وقت کی تنگی اور دیگر مصروفیات آڑے آتی رہیں۔اتفاق سے اسی سال مجاز کی بھی صدی تھی ان پر بھی کئی مضامین لکھنے پڑے۔فیض پر سات آٹھ مضامین ہو جانے کے باوجود کتاب شائع کرنے کا ارادہ نہ تھا لیکن صدی سال پر پاکستان میں فیض پر کئی نئی کتابیں دیکھ کر جہاں خوشی ہوئی وہیں ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے ایک بھی کتاب نہ دیکھ کر افسوس ہوا۔بس اسی احساس کے تحت میں ان معمولی مضامین کو کتابی شکل میں پیش کرنے پر مجبور ہوا۔

مجھے یہ احساس ہے کہ یہ مضامین غیر معمولی نہیں ہیں تاہم آج کے تناظر میں فیض کو سمجھنے کی ادنیٰ سی کوشش ضرور ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کتاب سے فیض شناسی میں کوئی اضافہ نہ ہوگا البتہ میری کتابوں کی فہرست میں ایک اضافہ ضرور ہو جائے گا اور قدرے یہ احساس واطمینان کہ ہم نے اپنی تحریک کے سب سے بڑے اور مقبول شاعر کو تحریک کے خادم کے طور پر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔بس اس جذبہ کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں_____

علی احمد فاطمی

دسمبر ۲۰۱۱ء

فیض - صوفی ازم سے مارکسزم تک

فیض کی نرم و نازک شاعری۔نظم کا غزلیہ انداز۔پرانی بوتل میں نئی شراب تمام
قارئین و ناقدین کو اس قدر پسند آئی کہ وہ آنکھ بند کر کے ہر طبقۂ فکر کے محبوب ومقبول
شاعر تسلیم کئے گئے اور ترقی پسند تحریک کی سب سے اہم اور بلند و بالا شخصیت۔ان کی
شاعری کی محبوبیت اور مقبولیت سے کسے انکار۔لیکن اس کے اسباب وعلل یا اس کے عوامل
ومحرکات پر غور کرنے کی عام طور پر زحمت نہیں کی گئی۔شاید اس کی ضرورت نہ تھی۔سب کو
آم کھانے سے مطلب پیڑ کو شمار کون کرے۔سب کے سب فیض کی دلنواز شخصیت اور
شاعرانہ غنائیت میں اس قدر گم تھے کہ کسی نے یہ جاننے کی ضرورت نہ سمجھی کہ ان سب
کے پیچھے محض روایتی عشق ومحبت یا حرف ولفظ کی دروبست کا معاملہ نہ تھا بلکہ ابتدائی تعلیم و
تہذیب اور فکر و دانش کے وہ سلسلے تھے جس نے فیض کو محض روایتی شاعر نہیں بننے دیا بلکہ
مفکر و دانشور بھی بنایا جس نے آگے بڑھ کر باقاعدہ ایک شکل اختیار کی اور ایک مضبوط
راستہ بنایا ورنہ اشتراکیت یا ترقی پسند تحریک سے وابستگی کوئی راہ چلتے حادثہ نہ تھی یا محمود
الظفر ،رشید جہاں اور سجاد ظہیر کی دوستانہ مروّت بھی نہ تھی۔

فیض نے اپنے گھر کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے ذریعہ جو غیر معمولی اثرات قبول کئے وہ قابلِ غور ہیں۔ان کے گھر میں ایک مخصوص قسم کا مذہبی ماحول تھا جس کے ڈانڈے تصوف سے ملتے تھے۔روایت ہے کہ فیض نے بچپن میں کچھ حصہ قرآن کا حفظ کرلیا تھا۔ایک مضمون میں خود فیض لکھتے ہیں ؎

''صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔معمول یہ تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اُٹھ بیٹھے۔ابا کے ساتھ مسجد گئے۔نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے قرآن شریف کو پڑھا اور سمجھا۔ابا کے ساتھ سیر کو نکل گئے، پھر اسکول.......''

ایک بار علامہ اقبال کی صدارت میں انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے سالانہ جلسے میں تلاوتِ قرآن پاک کا واقعہ انھیں ہمیشہ یاد رہا۔خود لکھتے ہیں.....''میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے ایک اونچی میز پر کھڑا کردیا گیا۔جب میں تلاوت کرچکا تو اقبال نے بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ ''تم کتنے ذہین بچے ہو۔'' گھر کا ماحول مذہبی تو تھا ہی روایتی اور فرسودہ بھی تھا۔ایوب مرزا نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''فیض ایک انتہائی قدامت پسند گھر کے ماحول میں پروان چڑھ رہا تھا۔خواتین میں پردہ اور برقعہ کا استعمال عام اور لازم تھا۔''

سب سے پہلے فیض انجمن اسلامیہ کے مدرسہ میں داخل کئے گئے۔خاصا اہتمام کیا گیا۔خود تو مخملی جیکٹ پہنی لیکن اسکول میں ٹاٹ بچھا ہوا تھا اور میلے کچیلے بچے تھے۔فیض کے نانا جو مولوی کم صوفی زیادہ تھے اور اکثر فیض کو اچھی اچھی سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے جس میں انسان دوستی کے پیغام زیادہ ہوتے۔جس کا اثر کم سِن فیض پر یوں پڑا کہ ان کی غریبی اور پریشاں حالی دیکھ کر فیض بھونچکے سے رہ گئے۔وہ ان غریب طلباء کے ساتھ ٹاٹ پر بیٹھ گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ اب ہم ان کے ساتھ ہی بیٹھیں گے اور

پڑھیں گے۔ یہ زندگی کا پہلا اور عجیب تجربہ تھا جس سے فیض کا بچپن دوچار ہوا۔ مولوی ابراہیم سیالکوٹی جو اس وقت کے فاضل، شفیق استاد مانے جاتے تھے ان کے درسِ ابجد کے ساتھ ساتھ درسِ انسانیت نے بھی اثرات مرتب کئے۔ قرآن اور حدیث کا درس بھی اُنھیں سے لیا۔ کچھ ایسا متاثر ہوئے کہ زندگی بھر مولوی ابراہیم کا ذکر عزت اور تکریم سے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ آگے چل کر وہ میر حسن اور یوسف سلیم چشتی کے بھی شاگرد ہوئے۔ عربی سے ایم۔اے بھی کیا۔

فیض کی ایک بڑی بہن بی بی گل تھیں جو فیض سے محبت رکھتی تھیں۔ فیض کو تیار کرنے و پیار کرنے میں آگے آگے رہتیں۔ بقول انھیں کے کہ فیض بچپن سے ہی حلیم طبع اور خاموش طبیعت کے تھے صفاتی مزاج رکھتے تھے۔ کھیلنے کودنے میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ایسے میں مذہبی تعلیم اور عمدہ استاد سے تربیت اور نانا سے قصہ کہانی کی رغبت نے فیض کے مزاج کو ایک راہ دی۔ ایوب مرزا نے ایک اور بات لکھی ہے۔ ''فیض کے ارد گرد گھریلو ماحول پر بیوہ، یتیم اور دکھی خواتین کی موجودگی کا گہرا اثر تھا۔ ایسے اثرات کے نتیجہ میں وہ بچپن سے ہی نرم پسند، نرم مزاج اور صلح جو ہو گیا۔'' ایک جگہ اور لکھا ہے۔

> ''فیض کی ایسی تربیت اور ماحول نے اس کی جبلت میں عمر بھر غم سہنے اور غصہ پینے کی خصلت ودیعت کردی۔ اس پر علم کے ساتھ ساتھ عمل کے نئے دریچے وا ہونا شروع ہوئے۔''

فیض کے والد کے صوفیوں سے اچھے تعلقات تھے۔ وہ اپنے ساتھ فیض کو بھی لے جاتے۔ انھیں میں سے ایک فیض الحسن صوفی درویش تھے جو فیض کو بہت پسند آئے۔ کیونکہ وہ شاعر بھی تھے اور رنگین مزاج بھی۔ ایک اور گاؤں تھا آلو مہار وہاں پر ایک درویش رہتے تھے۔ بڑے پیر تھے وہاں کا بھی اثر لیا۔ غرضکہ فیض کا مزاج اور ماحول ہم آہنگ ہو کر ایک ذہن تیار کر رہے تھے جس میں تصوف کا اچھا خاصا دخل تھا۔ اس دخل میں مدرسے کے غریب بچوں اور درویشوں اور نانا کے قصوں کا برابر کا دخل تھا۔

کینڈا کے ایک انٹرویو میں فیض نے صاف کہا......

''میں اپنے آپ کو ادنیٰ طریقے سے تصوف کا پیرو
سمجھتا ہوں۔ اس مسلک پر تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا
ہے۔ ہماری تو ساری کی ساری تربیت خالص دینی
ماحول میں ہوئی اور میری شاعری کا میرے ذہنی عقائد
سے کوئی تضاد نہیں۔''

ان کا خیال تھا کہ صوفی لوگ ہی اصل کامریڈ ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مفکّر اسلام کہے جانے والے اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال بھی تصوف کے حوالے سے اشتراکیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جوش انقلاب کے نعرے بلند کر رہے تھے اور حسرت اپنے آپ کو صوفی مومن اور اشتراکی عالم کہنے پر فخر محسوس کر رہے تھے۔

ایک حقیقت اور سمجھتے چلئے کہ فیض کے والد ایک معمولی کسان تھے اور اکثر جانوروں کے چرانے کا بھی کام کرتے تھے پھر تنگ آ کر وہ گاؤں سے لاہور بھاگ گئے جہاں انھوں نے ایک مسجد میں پناہ لی اور مذہب کے قریب آئے۔ تعلیم بھی حاصل کی۔ اپنی پریشانیوں کے پیش نظر ہی والد نے فیض کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ محلّہ کی لائبریری سے فیض کو افسانوی ادب کی کتابیں ملتی گئیں اور وہ کم عمری میں شاعری سے زیادہ داستان اور ناول پڑھ گئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاعری کی طرف رجوع ہونے کے بعد اور رومانی احساس سے سرشار ہونے کے باوجود ان کی دلچسپی مناظرِ فطرت سے زیادہ انسانی فطرت سے پیدا ہوتی گئی۔ ایک جگہ بیحد معنی خیز بات لکھتے ہیں۔

''ہمیں انسانوں سے جتنا لگاؤ رہا اتنا قدرت کے
مناظر اور نیچر کے حسن کو دیکھنے اور پرکھنے کا نہیں رہا۔
انہیں دنوں میں نے محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی محلّے ہیں
ان میں بھی اپنا ایک حسن ہے جو دریا، صحرا اور کہسار یا
سرو سمن سے کم نہیں۔''

انھیں بچپن کے دنوں میں جب وہ محض نو یا دس سال کے تھے یعنی ۱۸۔۱۹ ۲۰ء کا زمانہ تھا۔ عالم گیر لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ اسی محلّے کے گلی کوچوں میں ان کے کانوں میں آوازیں بھی پڑیں۔

''روس میں زارشاہی کا تختہ اُلٹ گیا''

'' لینن نے مزدور طبقہ کی حکومت قائم کر لی''

''سرخ انقلاب آ گیا ''

'' یہ روسی انقلاب کیسے ہوا''

'' یہ لینن کون ہے ؟ ''

ٹھیک انھیں دنوں جلیانوالہ باغ کا المناک واقعہ ہوا۔ انگریز حاکموں کے ذریعہ بے قصور ہندوستانیوں کا قتل عام ہوا۔ ملک بھر میں اس کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انگریزوں کے خلاف ہر طرف بغاوت اُمڈ پڑی۔ سیالکوٹ میں بھی احتجاجی جلسے ہوئے۔ جس کی گونج کم عمر فیض کے کانوں تک پہنچی۔ چاروں طرف نعرے گونج رہے تھے۔ اقبال کا ترانہ سارے جہاں سے اچھا بھی دلوں کو گرما رہا تھا۔ مگر فیض اس وقت صرف آٹھ سال کے تھے عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھ رہے تھے۔ شاعری کم اردو انگریزی کے ناول زیادہ پڑھ رہے تھے۔ جن میں عام انسانوں کے تئیں ہمدردی وحمایت تھی۔

وقت گذرا تو فیض اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور آئے۔ یہاں کا ماحول سیالکوٹ سے خاصا مختلف تھا۔ کالج کے دنوں میں ہوسٹل کے کمرے میں ان کے ایک دوست خورشید انور جو کامریڈ تھے۔ خفیہ باغی قسم کا لٹریچر رکھتے تھے جسے فیض بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ان سب کے ذریعہ اور اخبارات وغیرہ کے ذریعہ نوجوان فیض نے بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، شیر جنگ، کاکوری کیس، چٹاگانگ آرمی کیس میرٹھ سازشی کیس وغیرہ کے بارے میں سُنا اور پڑھا۔ ابتدا سے ہی پرورش پاتا ہوا ان کا شاعرانہ ذہن'' سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اور'' سر کٹانے کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'' جیسے مصرعے جو نعرے بن کر گونج رہے تھے فیض کے دل ودماغ میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ بقول فیض:۔

''روس لینن اور انقلاب کی بات ان بھولے بسرے
دنوں میں پہلی بار کان میں پڑی تھی۔''

دوسرا سابقہ اشتراکی و انقلابی ادب سے اس وقت پڑا جب فیض نے انگریزی ادب سے ایم۔اے کیا اور انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ یورپی ادب کا مطالعہ بھی ضروری تھا۔ چنانچہ فیض نے انھیں دنوں گوگل، پشکن، دوستوئفسکی، ترگنیف، ٹالسٹائے، چخوف باری باری سب کو بہت ڈوب کر پڑھا اور بقول فیض...... ''پرانے روس کی پوری دنیا نظر میں گھوم گئی۔''

اس پوری دنیا میں کمزور اور بے بس کسان اور انسان بھی تھے۔ عیاش اور خود پسند امراء بھی۔ انقلابی نوجوان تو اپنچی دانشور بھی۔ بے نور لکڑی کے گھر تو جگمگاتے ہوئے محلات بھی۔ ظلم اور اس کا توڑ جبر اور جذبۂ بغاوت۔ معاشرے کی مختلف قوتوں میں کشمکش اور پیکار کا عالم۔ ایک پُر اسرار سرزمین۔ یہ ساری واقفیت دوران تعلیم ہی ہوئی۔

مقامی ہنگاموں اور نعروں کے توسط سے انقلاب روس کی پرتیں اور جہتیں کھلتی جا رہی تھیں۔ ٹھیک اسی دور میں جب فیض اپنی تعلیم مکمل کر کے روزگار کی تلاش میں لگے تو انھیں اندازہ ہوا کہ یہ عالمی کساد بازاری اور اقتصادی بُحران کا زمانہ ہے۔ لامتناہی بے روزگاری۔ کسانوں اور مزدوروں کی بھٹک مری اور بے بسی۔ بہو بیٹی کی عصمت دری۔ ان سب نے بھی فیض کی سوچ کو ہوا دی اور سوشلزم کی طرف مائل کیا۔ اسی زمانے میں جب فیض کو امرت سر کے ایک کالج میں ملازمت ملی تو کالج کے ایک رفیق اور ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر محمود الظفر نے فیض کو ایک پتلی سی کتاب پڑھنے کو دی۔ یہ کتاب کمیونسٹ مینوفیسٹو تھی جو ان دنوں ممنوع تھی، خفیہ طور پر پڑھی جاتی تھی چنانچہ فیض جو اس وقت تک شاعری شروع کر چکے تھے اور روایتی عشقیہ غزلیں کہہ رہے تھے اور ایک ہلکے پھلکے عشق میں بھی مبتلا تھے۔ اس جذباتی کیفیت اور رومانی عمر میں فیض نے جب یہ کتاب پڑھی تو بقول فیض ۔

''میں نے ایک ہی نشست میں یہ کتاب پڑھ ڈالی۔
بلکہ دو تین بار پڑھی۔ انسان اور فطرت۔ فرد اور معاشرہ۔

معاشرہ اور طبقات۔ طبقے اور ذرائع پیداوار اور پیداواری
رشتے اور معاشرے کا ارتقا۔ انسانوں کی دنیا پیچ در پیچ اور
تہہ در تہہ رشتے ناتے، قدریں، عقیدے، فکر و عمل وغیرہ کے
بارے میں یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزینۂ
اسرار کی کنجی تھما دی ہے۔ یوں سوشلزم اور مارکسزم سے اپنی
دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔"

اس کے بعد فیض نے لینن کی کتابیں پڑھیں اور اکتوبر انقلاب کے بارے میں بھی جانا۔ اور اچانک صوفی اور عاشق فیض.... اشتراکی فیض ہو گئے۔

اور اس نوع کی شاعری کرنے والے فیض.......

رسیلے ہونٹ معصومانہ پیشانی حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لئے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں

اس مزاج کی نظم کہہ اٹھے..........

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

نقشِ فریادی جو فیض کا پہلا شعری مجموعہ واضح طور پر دو حصّوں میں تقسیم نظر آتا ہے۔ فیض نے اسے حصّہ اوّل اور حصّہ دوئم میں تقسیم کیا ہے اور اس ضمن میں بعد میں ایک مضمون بھی لکھا جس کا عنوان ہے نقشِ فریادی کی تخلیق کے دو ادوار جس کی ابتدا ہی ان جملوں سے ہوتی ہے۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ۲۰ء سے لے کر ۳۰ء تک اور ۳۰ء سے لے کر ۴۰ء تک کے یہ جو دو دور ہیں یا دس برس کا عرصہ ہے ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے۔ ہر لحاظ سے مختلف۔ ادبی اعتبار سے جذباتی اعتبار سے سیاسی اعتبار سے اور لوگوں کے ذہنی مزاج کے اعتبار سے چنانچہ نقشِ فریادی کے پہلے حصے کی جو نظمیں ہیں وہ ۲۸ء سے ۳۴ء تک یعنی ہماری طالب علمی کے زمانے میں لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر پر پہلے دور کا اثر ہے۔ اور ۳۵ء کے بعد کی نظمیں جب کہ ہم نے مُدرسی شروع کی تھی اور جو بیشتر امرتسر میں لکھی گئی تھیں دوسرے دور سے متعلق ہیں۔''

پہلے حصہ میں اگر اس مزاج کی غزلیں ہیں۔

ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے
دل رہینِ نیاز ہو جائے
بے کسی کارساز ہو جائے

ہمت ایسی نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی
اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

تیز ہے آج دردِ دل ساقی
تلخیِ مے کو تیز تر کر دے

اب ذرا دوسرے حصے کی پہلی غزل کے یہ اشعار دیکھئے ۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اور ایک نظم سوچ کے یہ بند دیکھئے ۔

میرا دل غمگیں ہے تو کیا
غمگیں یہ دنیا ہے ساری
یہ دُکھ تیرا ہے نہ میرا
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہوجائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

اس کے علاوہ چند روز اور مری جان، کتے، بول، موضوع سخن وغیرہ نظموں کا موضوع۔ تیور اور آہنگ، اشتراکی و انقلابی رنگ و آہنگ میں ڈوب جاتا ہے لیکن یہ نعرہ انقلابی والا آہنگ نہ تھا بلکہ اس میں ایک ایسی انسانی دردمندی اور سوزش تھی جو اُنھیں تصوّف سے حاصل ہوئی تھی۔

اس درمیان اگر ایک طرف فیض فضل الٰہی قربان اور دادا فیروز الدین جیسے بزرگ انقلابیوں کے قریب آئے اور ان کے ساتھ جیل میں بھی وقت گذارا تو دوسری طرف چند ترقی پسند نوجوان جو یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اور مارکسزم کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستان میں اشتراکی نظریہ کی تبلیغ اور ترقی پسندی کی تحریک میں مصروف ہو گئے۔ ان میں سجاد ظہیر، زیڈ احمد، ملک راج آنند وغیرہ ساتھ تھے۔ فیض ان سب کے قریب آئے اور پھر آتے ہی چلے گئے۔ ان سب کے ذریعہ فیض کو اشتراکی لٹریچر زیادہ سے زیادہ پڑھنے کو ملا۔ خود فیض لکھتے ہیں ۔

> ''یہ سب کچھ پڑھ کر، سُن کر ہم نے اس دوسری تصویر میں رنگ بھرنے شروع کئے۔ غیر طبقاتی معاشرے کی تصویر جہاں کوئی سرمایہ دار نہیں۔ کوئی جاگیردار نہیں اور زمیندار نہیں۔ نہ کوئی آقا ہے نہ کوئی بندہ، نہ کوئی تلاشِ معاش میں سرگرداں ہے نہ فکرِ فردا میں گرفتار۔ جہاں مزدور کسان راج کرتے ہیں اور ہر معاملہ ان کی مرضی سے طے پاتا ہے۔''

فیض نے نہ صرف شاعری کا رُخ بدلا۔ علم کے ساتھ عمل کا دامن بھی پکڑا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی تاریخی کانفرنس میں شریک ہوئے اور پنجاب کی انجمن کے جنرل سکریٹری بھی ہوئے اور اخبارات میں لکھنے لگے، دیگر مزدوروں کی انجمنوں سے بھی وابستگی ہوئی۔

۱۹۳۹ء میں فیض نے مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے کیمرج یونیورسٹی میں داخلہ لینا

چاہا لیکن دوسری جنگِ عظیم نے مسئلے پیدا کر دیے۔ انگریزی حکومت نے انقلابیوں پر غم وغصہ دکھانا شروع کیا۔ ادھر کانگریس نے بھی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کر دی۔ مہہ وسال آشنائی میں فیض لکھتے ہیں۔

''یہ کافی ہنگامہ آرا دن تھے۔ میں نے امرتسر کو
خیر آباد کہہ کر لاہور کے ایک کالج میں ملازمت کر لی تھی۔
ان دنوں ہم جیسے لوگوں کو جو گذشتہ کئی برس سے ہٹلرزم اور
فاشزم کے خلاف لکھنے لکھانے میں بھی مصروف تھے اور
انگریزی سامراج کے خلاف عملی طور پر مصروف کار بھی۔''

اس تصویر کو فیض نے اور قریب سے دیکھا اور سمجھا اور فوج میں ملازمت کر لی اور وہاں بھی پڑھنے لکھنے کا کام سنبھالتے رہے۔ انھیں دنوں شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے ادب کو پڑھنے کے مواقع دستیاب ہوئے۔ فیض لکھتے ہیں:۔

''انھیں دنوں ایلیا ہرن برگ نے اپنی کسی نوٹ
میں لکھا تھا جواب تک میرے دل پر کندہ ہے وہ کچھ یوں
تھا کہ میاں بیوی آپس میں ناتے توڑ سکتے ہیں۔ محبتیں
چھوٹ سکتی ہیں اور عاشق ومحبوب جدا ہو سکتے ہیں لیکن
ایک رشتہ جو کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتا ماں بیٹے کا رشتہ ہے
اور ہمارا وطن ہماری ماں ہے۔''

دوسری جنگ عظیم میں فاشسٹوں کی شکست ہوئی، اتحادیوں کی فتح تو فیض نے لکھا۔

''جنگ کی یہ تصویر بہ یک وقت بھیانک بھی تھی
اور ولولہ انگیز بھی۔ اس کے بعد جب فاشسٹ طوفان
چڑھ کر اُتر گیا.....اتحادیوں کی فتح ہوگئی اور برلن پر سُرخ

جھنڈا لہرانے لگا تو اسی تصویر کے بہت سے نقوش دلوں
میں ثبت ہو گئے۔''

پھر کچھ راہیں ہموار ہوئیں۔راستے کھلے۔انجمن سرگرم ہوئی۔مشاعرے عام ہوئے اور کھلے عام ترقی پسند گیت گائے جانے لگے۔ یہ تھیں وہ بنیادیں جن پر فیض کا اشتراکی نظریہ اوران کی انسانی وانقلابی شاعری کی عمارت کی تعمیر ہوئی۔

یہ سلسلہ یہیں پر رُک نہیں گیا۔ ہندوستان آزاد ہوااور تقسیم بھی ہو گیا۔راول پنڈی سازش کیس، جیل، روس کا سفر، روسی و مارکسی ادیبوں سے ملاقاتیں، دنیا کے دوسرے ترقی پسند ادیبوں سے ملاقاتیں اور تبادلۂ خیال،نظریات میں پختگی اور بالیدگی۔ مثلاً ۱۹۵۷ء میں جب ناظمِ حکمت سے ملاقات ہوئی تو وہ دوستی میں بدل گئی۔ناظم حکمت وہ شاعر تھے جوانا تولیہ میں جنگ حریت میں شرکت کر چکے تھے۔اس کے بعد عوام کے لئے تحریری جدوجہد میں پوری زندگی گذاری۔فیض،سردار وغیرہ پران کا گہرا اثر تھا۔شعرو شاعری کے حوالے سے فیض اور ناظم حکمت کے درمیان گفتگو کا سلسلہ خاصا طویل ہے۔ اس گفتگو اور صحبتوں سے متاثر ہو کر فیض نے اسی انداز واسلوب میں بعض نظمیں ماسکو میں کہیں اور ناظم کی نظموں کے ترجمے بھی کئے۔

ایلیا اہرن برگ سے بھی فیض کی ملاقاتیں لینن گراڈ شہر میں ہوئی۔ یہ شہر پشکن کا تو ہے ہی۔یہیں پر اکتوبر انقلاب کی توپ داغی گئی تھی اور یہیں پر لینن نے انقلابی حکومت قائم کی تھی اور بھی بہت کچھ ہے جسے فیض نے بہت قریب سے دیکھا۔اسی شہر میں فیض کی ملاقات ایلیا اہرن برگ سے ہوئی۔روس کے جدید ادب پر باتیں ہوئیں اور فیض کے ذہن میں برگ کا یہ فقرہ جذب ہو گیا۔

''ہم نے وہ ذات پیدا کی جو آپ ہزار سال میں
نہیں کر سکتے۔ہم نے بڑا پڑھنے والا پیدا کیا ہے۔گریٹ
ریڈر جو آپ کے معاشرے میں نہ اب ہے اور نہ اس
موجودہ صورت میں ہوگا۔''

اور پھر برگ نے یہ بھی کہا کہ قاری وہی ادب پڑھتا ہے جو اس کے معیار کو پہنچے۔ برگ کا یہ قول تو ترقی پسند عوامی شاعروں کے قول زریں بن کر حفظ ہو گیا کہ ......ایک ادیب کے لئے ۔یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لئے ہو۔اسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت رکھنا چاہئے جو صرف ایک لمحے کے لئے ہو اگر اس لمحے میں اس قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے.....کیفی اعظمی نے آخر شب کی ابتدا انھیں جملوں سے کی ہے۔

روس کے اسی سفر میں فیض نے سارتر سے بھی ملاقات کی۔یوں تو سارتر فلسفۂ وجودیت کے لئے مشہور تھا جس کے چرچے بہت ہوتے ہیں لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد .....ویت نام اور الجزائر کی جنگِ آزادی نے اس کے نظریات بہت حد تک بدل ڈالے جس کے چرچے کم ہوتے ہیں۔فیض نے سارتر سے مختلف قسم کے سوالات کئے۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کے نظریہ ادب میں عاشقانہ یا غنائیہ ادب کا بھی کوئی مقام ہے تو جواب میں سارتر نے کہا۔

> ''ہے کیوں نہیں ۔ وہ تو ہر دل کا ایک فطری تقاضا تھا جس کی تسکین لازم ہے۔لیکن وہ تو ایک پگڈنڈی ہے۔شاہراہ نہیں ہے۔ادب کی شاہراہ کو جو کسی دور میں اسے ایک منزل سے اگلی منزل تک لے جاتی ہے۔اس دور کی ذہنی ،فکری جذباتی اور اخلاقی افق پر پوری طرح محیط ہونا چاہئے ورنہ بات آگے نہیں بڑھے گی قبائلی دور کے شاعر کو اپنے قبیلے کے افسانہ اور اساطیر اور قبیلے پر بیتے ہوئے واقعات اور تجربات کے علاوہ اور کچھ جاننے کی ضرورت نہ تھی۔اس عہد کا تقاضا ہی اتنا تھا۔لیکن آج کل کا ادیب اگر انسانی معاشرے کی تاریخ اور معاشیات کی جدلیات سے بے بہرہ ہے تو ہم عصر حقائق کے بارے میں اس کا

جذباتی اور جبلّی ردِعمل خواہ کتنا بھی صحیح ہواسے باہر کی دنیا تو کیا
اپنے اندر کی دنیا کے کھوٹے کھرے کا بھی پورا اندازہ نہ ہو سکے
گا اور تذبذب اور بے یقینی اس کی تحریروں میں ملے گی۔"

روس کے اسی سفر میں سلیمانوف، آتماتوف وغیرہ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔
غرضکہ عمر اور خلق کے اس طویل سفر میں فکر ونظر نے کروٹیں لیں اور فیض کا تخلیقی سفر جو نقش فریادی سے لے کر غبار ایام تک پھیلا ہوا ہے۔ طرح طرح کے علمی و فکری تجربات سے معمور ہے۔ ان چار مصرعوں سے شروع ہونے والا سفر۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

نومبر ۸۴ء کی اس غزل پر ختم ہوتا ہے۔

بہت ملا نہ ملا زندگی سے غم کیا ہے
متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے
کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مصرف
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشمِ نم کیا ہے
سجاؤ بزم غزل گاؤ جام تازہ کرو
بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے

درمیان میں اس نوع کی شاعری بھی ہے۔

"آج بازار میں پا بہ جولاں چلو"
"صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے"
"ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ"
"آجاؤ افریقہ۔ آؤ ببر کی چال۔ آجاؤ افریقہ"

آج اور آج کے غم کے نام
کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

جہاں ایک طرف دستِ صبا کے دیباچے میں فیض نے یہ کہا کہ ؎

''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اُس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔''

تو دوسری طرف یہ بھی کہا ؎

''ایک شاعر کا کام اس سے نہیں جانچا جانا چاہئے کہ اس کے اشعار کی تعداد کیا ہے بلکہ اس امر سے کہ اسے اپنے لکھے سے کتنا حظ و سرور حاصل ہوا۔ ہم کسی شاعر سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس موضوع یا اس خیال یا اس نمونے پر شعر لکھ دو۔ اسے تو ہزار طرح کے چھوٹے موٹے ریزہ ریزہ مضامین، خیالات اور واقعات میں سے اپنا انتخاب خود کرنا ہوتا ہے اور اسے حق ہے کہ جو اسے پسند ہو اسی کے گن گاتا رہے .... مجھے اس سے اتفاق ہے کہ زندگی یا حقیقت کو صداقت اور صحیح طور پر پیش کرنا چاہئے لیکن کس پیرائے میں کس صورت میں یا کس انداز میں اس کا فیصلہ ادیب کے اپنے اختیار میں ہونا چاہئے۔ وہ فوٹو گرافر نہیں ہے مصوّر ہے۔''

فیض کا سرمایۂ فکر اگر صوفی ازم سے شروع ہو کر مارکسزم پر ختم ہوتا ہے تو سرمایۂ شعری انھیں دونوں خیالات کے درمیان ڈولتا نظر آتا ہے۔ جہاں فکر و نظر،

اسلوب و آہنگ کا ایک ایسا مفکرانہ وفنکارانہ امتزاج وانجذاب نظر آتا ہے جو فیض کی اپنی منفرد شناخت قائم کرتا ہے۔ نیز فیض کا اپنا سلیقہ، رویّہ، تہذیبِ نفس اور تہذیبِ ادب' ایک مخصوص وقار واعتبار قائم کرتا ہے۔ جہاں ایک طرف رجائیت ہے تو دوسری طرف غنائیت۔ان دونوں کے مابین ہے انسانیت اوراشتراکیت۔

اس طرح انھوں نے صوفی ازم سے مارکسزم کا سفر کامیابی سے طے کیا اور ایک غیر معمولی شاعری اور دانشوری کے ذریعہ عمدہ وعظیم شاعری کے لازوال نقوش ثبت کر گئے اور ترقی پسند شاعری کی تاریخ تو بنے ہی تہذیب بھی بن گئے۔اشتراکی اور جمالیاتی تہذیب وتحریم' تبھی تو مجروح سلطانپوری نے کہہ دیا....."فیض احمد فیض ترقی پسندوں کے میر تقی میر تھے۔"

فیض - جمال سے جلال تک

شعروادب کے حوالے سے یہ بات بار بار دُہرائی گئی ہے کہ مزاحمت و احتجاج وغیرہ فطری عناصر تو ہیں لیکن تخلیقی اظہار میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ادب کا چہرہ مسخ نہ ہونے پائے یعنی ادب کی ادبیت یا شعر کی شعریت ہر حال میں برقرار رہنی چاہیے۔ گذشتہ دہائیوں میں ایک خاص طبقۂ فکر کی جانب سے یہ بات اتنی بار دُہرائی گئی ہے کہ بظاہر یہ بات معقول سی نظر آتی ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ ادب ہے کیا اور اس کی ادبیت کیا ہے اور شعریت کسے کہتے ہیں۔ کچھ نقادوں کے تیئں اگر ادب و شاعری سے مُراد محض تغزّل ہے۔ نغمگی ہے لطافت ہے تو پھر کسی نوع کی مزاحمتی شاعری شعروسخن کے نرم و نازک چہرے کو مسخ تو کرے گی یا کم از کم خراش تو ڈالے گی ہی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نغمگی کا چہرہ الگ ہوتا ہے اور کرختگی کا الگ ___ دونوں کی حسیّات و کیفیات الگ الگ ہوتی ہیں۔ اگر زندگی میں کرختگی ہے تو شاعری میں بھی کرختگی کے آثار نظر آئیں گے۔ یہ ممکن نہیں کہ

چاروں طرف آہ وزاری ہو' شور وغل ہو' رنج وغم ہو اور شاعر کسی ٹیلے پر بیٹھا ان خونریز و دلآزار مناظر کو دیکھ کر بانسری بجا رہا ہو۔ چاروں طرف شور وغل ہو تو سرگوشیاں از خود اپنی معنویت کھو دیتی ہیں۔ جس طرح زندگی کے چہرے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح شعر وادب کے چہرے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہر نوع کی شاعری کی شعریات الگ الگ ہوتی ہے یا ہونی چاہئے۔ زندگی بذاتِ خود کہیں نغمہ ہے الاپ ہے کہیں چیخ و پکار بھی۔ اس نغمہ الاپ اور چیخ و پکار کو الگ الگ ڈھنگ سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہماری مشکل یہ رہی ہے کہ اردو تنقید نے یا اردو شعریات نے ان سب کو الگ الگ ڈھنگ سے سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ غزلیہ شاعری یا عشقیہ شاعری کا مزاج و مذاق اور شعریات اتنی غالب رہی کہ نظم کی حقیقت، ماہئیت ہم نے ٹھیک سے سمجھی ہی نہیں چہ جائیکہ مزاحمت اور احتجاج جسے ابتدا سے ہی اردو کے معیار پرست نقادوں نے مذموم نگاہوں سے دیکھا اور ناپسند کیا۔ یہ ایک لمبی بحث ہے جسے محض ایک مقالہ میں سمیٹ پانا ممکن نہیں۔ لیکن اتنا سمجھنا ضروری ہے کہ اضطراب، مزاحمت، احتجاج اور انقلاب ان سب کی الگ الگ منزلیں ہیں کیفیتیں ہیں۔ کلاسیکی تصورات کی انسان دوستی کی شاعری، مزاحمتی شاعری اور بعد کے دور کی احتجاجی اور انقلابی شاعری ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی الگ الگ ابواب ہیں لیکن نادانی اور تن آسانی کی وجہ سے سب کا گھالہ میلہ ہو گیا اور مخالف نظریہ نے اسے نعرہ بازی کی شاعری کہہ کر راندۂ درگاہ کر دیا ناپسندیدہ قرار دیدیا۔ ان کا محدود ذوقِ جمال اور تعیش پسندانہ نظریہ اور آگے بڑھ کر مقصدیت، خارجیت اور سماجیت وغیرہ کو بھی مذموم نگاہوں سے دیکھتا رہا اور غیر منطقی بحثیں کرتا رہا۔

یہ سچ ہے کہ مزاحمت عربی لفظ ہے اور زحمہ سے مستعار ہے جس کے لغوی معنی حریف سے ٹکر لینے یا مدافعت کرنے کے ہوتے ہیں انگریزی میں اس کا بدل Resistance ہے لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جو فرق

Resistance اور Protest میں ہے اور جو فرق Protest اور Revolution میں ہے وہی فرق مزاحمت، احتجاج اور انقلاب میں ہے۔ ہمارے پاس ایک اور لفظ بغاوت بھی ہے جو انقلاب کے بہت قریب ہے ___ ہمارے ایک دوست نے اقبال کے اس شعر ''جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روٹی/ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو'' کے بارے میں کہا کہ احتجاج کی یہ آواز چیخ میں بدل گئی ہے اور گوشِ ادب پر گراں گزرتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ چیخ نہیں ہے بلکہ غم و غصہ میں ڈوبی ہوئی۔ احتجاج کی وہ منزل ہے جہاں سے انقلاب کی شروعات ہوتی ہے۔ پھر جب زندگی میں کبھی کبھی چیخ کا اپنا ایک عمل ہے' ضرورت ہے تو پھر شاعری میں کیوں نہیں۔ ایک خاص نوع کی احتجاجی شاعری میں چیخ کی وہی اہمیت ہے جیسے ایک خاص نوع کی شاعری میں خاموشی کی۔ سب کی اپنی الگ الگ اہمیت و افادیت ہے اور اگر ان سب کی اہمیت ہے اور یقیناً ہے تو پھر اس کی جمالیات بھی ہوگی۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے/ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔ جیسا شعر فکر و فن اور معیار پرستوں کی جمالیات کے اعتبار سے جو بھی حیثیت رکھتا ہو لیکن ایک بڑے ملک کی بڑی تاریخی، سیاسی اور انقلابی زندگی میں اس نے کلیدی رول ادا کیا اور حصولِ آزادی میں بیحد اہم حصّہ دار رہا۔ اگر کوئی شعر روایتی شعریات کے پیمانے پر بہت کھرا نہیں ہے لیکن سماجیات اور سیاسیات کے ضمن میں غیر معمولی کامیاب ہے اور تاریخ میں بیحد اہم رول ادا کر رہا ہو یا ادا کر چکا ہو تو اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایلیا اہرن برگ کے یہ مشہور جملے دہراتا ہوں ۔

''ایک ادیب کے لیے یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لیے ہو اسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہئے جو صرف ایک لمحہ کے لیے ہو اگر اس ایک لمحہ میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔''

زندگی اک ترقی پذیر عمل ہے اور ارتقا کا یہ عمل فکر و فطرت کے بیحد قریب ہوتا ہے جس کا جز و اعظم زندگی کو بہتر سے بہترین بنانا اور انسان کو خوشحال اور انسانی معاشرہ کو خوبصورت بنانا ہے اور سو فیصدی یہ ایک ایسا جمالیاتی عمل ہے جس پر انسانی تہذیب و تمدن کا دارو مدار ہے۔ تاریخ بھی جمالیات کے اسی پہلو پر ٹکی رہتی ہے۔ ملک و معاشرہ مورخ و مفکر اس تبدیلی کو جس انداز سے بھی دیکھے لیکن شعر و ادب میں اس کا ایک ہی پہلو سب سے بڑا ہے اور وہ ہے انسانی تہذیب کا ارتقا جو جمالیاتی رُخ اپنائے بغیر مائل بہ ارتقا ہو ہی نہیں سکتا۔ قوتِ تخلیق اور پرواز تخیل اسی امکانِ انسانی کی تلاش کے ناگزیر عناصر ہیں۔ اس لیے شاعری خواہ عشقیہ ہو یا مزاحمتی خواہ رومانی ہو یا انقلابی اس امکان کو چھوئے بغیر قابلِ قدر ہو ہی نہیں سکتی اس لیے فکر مارکسی ہو یا غیر مارکسی انسانی شعور اور سنجیدہ ذھن اسی امکان اور اذھان کے ساتھ ہی آگے بڑھتا ہے۔ جذبات اور احساسات کی تمام تبدیلیاں اگر اس شعور سے وابستہ ہیں تو ان کی جمالیات کو انسانی جمالیات سے الگ کر کے دیکھ پانا ممکن نہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے ہر شاعر اپنے عہد کا مجاہد ہوتا ہے اپنے عہد کا ضمیر ہوتا ہے اس کی آواز ہوتا ہے اور اس آواز کی کوئی سرحد نہیں ہوتی جیسے انسانیت کی کوئی سرحد نہیں ہوتی ____ لیکن اس آواز کو انسانیت کی لے بننے میں نغمہ اور گیت بننے میں اور اس کی جمالیات قائم ہونے میں ایک عمر تو لگتی ہی ہے۔ تجربہ و مشاہدہ کی عمر، شعور و ادراک کی عمر ____

یہی وجہ ہے کہ فیض نے جب شاعری شروع کی تو ابتداً روایتی طور پر جنس و جسم کی عشقیہ شاعری کی لیکن جلد ہی ایک واقعہ کے تحت ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے لیکن اس کے باوجود مدتوں اُن پر حسرت موہانی، اختر شیرانی اور اردو کی کلاسیکی شاعری اور بالخصوص غالب کی شاعری کا اثر رہا۔ تحریک سے وابستگی کے باوجود وہ مزاحمتی اور احتجاجی شاعری کو رومانی اسلوب سے الگ نہیں کر سکے۔ نقش فریادی اور دستِ صبا کی بعض ممتاز نظموں کو ملاحظہ کیجئے ان میں اضطراب ہے مزاحمت بھی لیکن اسلوب سے سمجھوتہ نہیں۔ نظم تنہائی میں تو اسلوب اس قدر مبہم ہوگیا ہے کہ آج تک عام قارئین کیا

بڑے بڑے ناقدین بھی نظم کے مرکزی خیال کو محض تنہائی یا احساس تنہائی سے وابستہ کر کے دیکھتے ہیں۔ کم لوگ ہی اس نظم میں پنہاں ان سیاسی اشاروں کو سمجھ سکے ہیں جو ایک مخصوص لمحہ میں بائیں بازو کی شکست کے حوالے سے محرومی و مایوسی بن کر احساس تنہائی میں ڈھل گئے ہیں اور مسیحا کا انتظار محبوب کا انتظار سمجھا جاتا رہا۔ یہ تصور نقادوں کا کم فیض کی ابہام گوئی کا زیادہ ہے جو اکثر حافظ اور غالب کے زیر اثر اُنھیں مزاحمتی شاعری کی اصل راہ پر لانے سے روکتی رہی۔ زنداں میں بھی کہی گئی شاعری کو بغور ملاحظہ کیجئے۔ ان سب میں گہرا مزاحمتی اور سماجی شعور تو ہے لیکن رنگ رومانی ہے اور کہیں کہیں ابہامی ـــــ اسی لئے ایک جگہ سردار جعفری نے کہا ـ

"یہ ہیئت پرستی کا نتیجہ ہے کہ فیض ایسا با کمال شاعر ابہام کا شکار ہو کر رہ گیا۔ یہی نہیں بلکہ مبہم استعاروں سے نظم کو آراستہ کرنے کی کوشش نے ایک اور گل کھلایا اور اس نظم (صبح آزادی) کے مصرعے بے معنی ہو کر رہ گئے۔"

(ترقی پسند شاعری کے بنیادی مسائل)

خود فیض نے بھی اپنی شخصی، مزاجی کیفیت کا اظہار نثر و نظم میں کئی جگہ کیا ہے۔ ایک گفتگو میں کہتے ہیں "بھئی ہم تو ایسے ہی ہیں ہم معشوق کے دروازے پر دستک دیں گے تو ایسے ہی دیں گے۔" اور شاعری میں بھی ـــــ "سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا۔"

لیکن یہ سلسلہ اسی وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ فارسی میں حافظ، اردو میں غالب اور انگریزی میں براؤننگ سے متاثر رہے لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے اور روس فلسطین، بیروت، لندن وغیرہ میں ان کی آمد و رفت ہوئی سب کے سماجی و سیاسی حالات دیکھے وہاں کی انقلابی شاعری کی گونج سُنی۔ ناظم حکمت، پابلو نرودا، ایلیا اہرن برگ، سارتر اور روس کے دیگر انقلابی مفکرین و شعرأ کے قریب آئے ـــــ ادھر اپنے وطن پاکستان کے سماجی اور سیاسی حالات بھی بد سے بدتر ہونے لگے۔ فوجی آمریت نے شکنجے کے حبس اور گھٹن کا ماحول ملا ظلم و جبر کے دائرے

تنگ ہوئے تو فیض با قاعدہ نہ صرف قومی صحافت سے وابستہ ہوئے بلکہ مزدوروں اور ملازمین کی تحریکات سے بھی وابستہ ہوتے گئے ____ ان کمزور حالات کو اپنی چشم بینا سے دیکھ کران کا دردمند دل اور انسان دوست شخصیت پگھلتی چلی گئی ۔ جیسے جیسے پگھلتی گئی ویسے ویسے جمال جلال میں تبدیل ہوتا گیا اور ان کے نہ صرف فکری بلکہ لفظیاتی اسلوب میں غیر معمولی تبدیلی آتی گئی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وہ انقلابی نظمیں جو عوام کی سطح پر بیحد مقبول ہوئیں ان میں سے اکثر بعد کے دور کی ہیں ۔

فیض نے ۴۲ ء سے ۴۷ ء تک کچھ نہیں کہا لیکن ۴۷ ء کے بعد جب وہ اپنی فوجی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر لاہور کے مختلف اخباروں سے وابستہ ہو گئے اور صحافت کے قریب آئے اور براہ راست عالمی سیاست کے بھی تو اسی موڑ اور مقام سے ان کی شاعری ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے درمیان کا دور قدرے تذبذب کا ہے جو ان کی نظم سوچ میں نظر آتا ہے ۔ لیکن یہ دور بیحد مختصر ہے ۔ فیض کے اس دور اور اس تبدیلی کو اردو کے خالص ادبی نقاد نظر انداز کر جاتے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ ہندوستان کے اکثر نقادوں کو اس بات کا علم کم رہا کہ فیض پاکستانی صحافت اور سیاست میں کس طرح سرتاپا غرق رہے اور اس غرقابی نے ایک نئے انقلابی کو جنم دیا ۔ دوسری وجہ اس سے زیادہ اہم ہے اور وہ ہے اردو شاعری کا عشقیہ و روایتی مزاج ۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم صدیوں سے خلوت کی شاعری کے عادی رہے ہیں جلوت کے نہیں ____ ہماری تہذیب شاعری میں ہماری سرشت میں عشق و محبت راز و نیاز ، سرگوشی اور دھیما پن اس قدر پیوست رہا کہ ہم نے فیض کی مزاحمتی و انقلابی شاعری کے دھیمے پن کو بھی ایک وصف قرار دیا جبکہ انقلاب کی شعریات میں بلند آہنگی ہی اس کا وصفِ اعظم ہوا کرتی ہے ۔ دراصل ہم فریاد کے عادی رہے ہیں للکار کے نہیں ۔ ہم نے غنائیت اور ایہام کو ہی شعریات کا نام دیدیا ۔ ابتداً فیض بھی اسی کا شکار تھے ۔ حافظ ، سودا ، غالب کی ایہام گوئی انھیں پسند آتی رہی ۔ انگریزی میں براؤننگ کے ڈرامنک مونولاگ سے بھی متاثر رہے اور اس تکنیک کو نظم تنہائی میں استعمال کیا جسے روایت پسند ، در جدیدیت پسند

نقادوں نے پسند کیا۔

فیض کو اس تنہائی یا ابہام سے نکلنے میں دیر تو لگی لیکن جلد ہی انھیں احساس ہو گیا کہ شاعری محض تخلیقی اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ جذبات و احساسات، افکار و نظریات کی ترجمانی کا موثر ذریعہ بھی ہے اور یہ ترجمانی محض خواص تک نہ ہو بلکہ عوام تک بھی ہو۔ اتفاق سے اُنھیں دنوں پاکستان کے حالات کچھ اس طرح بدلے کہ وہ عوامی ثقافت کے قریب آئے اور ثقافتی اداروں کی نہ صرف سربراہی کی بلکہ بعض منصوبوں کے تحت تحقیق و تلاش کی ابتدا ہوئی۔ خود فیض نے ایک کتاب لکھی۔ ہماری قومی ثقافت، جس میں خالص عوامی ثقافت کی جستجو نظر آتی ہے۔ فیض کے پرانے دوستوں کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں احمد سلیم اور عبدالرؤف ملک کی کتابوں میں اس دور کے فیض کے عوامی رشتوں اور انقلابی رویّوں کے تذکرے بیحد اطلاعاتی اور معنی خیز ہیں۔ احمد سلیم نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے۔

> ''فیض لوک ورثے کے سائنسی مطالعے کو بیحد اہمیت دیتے تھے۔ لوک فنکاروں اور گائیکوں کی بے حد قدر کرتے تھے اور کہتے تھے ہمارا وجود اور بقا ان فنکاروں سے ہے' فنکار ہماری وجہ سے نہیں ہیں۔
>
> ایک بار پٹھانے خاں کا نام سُن کر وہ دوڑے چلے آئے۔ پٹھانے خاں اپنے سادہ مزاج اور دیہی پس منظر کے باوجود فیض صاحب کے ادبی مقام اور مرتبے سے واقف تھے انھوں نے پریشان ہو کر فیض سے کہا ___ ''سائیں تسی کیوں آ گئے میکوں سڈ لہر نے'' ___ اس پر فیض

نے ان کو اپنے بازوؤں میں لے کر کہا ___

''پٹھانے خاں ہماری دھرتی کی پہچان ھیں'

میں اپنی پہچان کے پاس آیا ہوں۔''

اس وقت تک فیض کے سمجھ میں آ چکا تھا کہ دھرتی کی پہچان یعنی عوامی پہچان ہی دراصل صحیح انسانی پہچان ہوا کرتی ہے۔

کچھ لوگوں نے اس طرح سے بھی سوچا کہ فیض ان سب میں کہاں سے پھنس گئے اور عاشق فیض عشقیہ وغنائیہ شاعری کرنے والا شاعر فیض کہاں بھٹک گیا لیکن کم لوگ اس بات کو سمجھ پائے کہ فیض کے ذہن اور وژن کو بڑا اور عالمی بنانے میں ان واقعات کا غیر معمولی دخل ہے۔سردار جعفری نے ذکرِ یار میں اچھی بات لکھی ہے ۔

'' بعض کو تکلیف ہوتی ہے کہ ان واقعات
میں پڑ کر ایک شاعران جھگڑوں میں کہاں پھنس گیا
___ لیکن انھیں نہیں معلوم کہ فیض کے نئے شعور پر
دھار رکھنے میں ان واقعات کا کتنا ہاتھ ہے۔اسی
شعور کی دھار جو فیض کی ۱۹۴۷ء کے بعد کی شاعری
میں تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔''

صحافتی ، ثقافتی اور عوامی زندگی گذارتے ہوئے فیض کے احساس ادراک میں پہلے پاکستانی حالات پھر دنیا کے حالات داخل ہوئے جس کی تفصیل فیض سے متعلق کتابوں میں بھری پڑی ہے بس یوں سمجھئے کہ یہ مصرعے ۔

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

جو کبھی محض مصرعے تھے اب نعرے بن کر فیض کی شاعری سے گونج اُٹھے۔

سرِ مقتل جو قوالی لکھی اس کا یہ مصرعہ مشہور ہوا ــــــ ''کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے''
''ہم بھی دیکھیں گے'' میں جو ایک تیور ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں پہلی بار پاکستان
میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس ہوئی۔ دشمنوں نے اس کانفرنس پر حملہ کر دیا۔ یہ نظم اسی موقع پر
پڑھی گئی بلکہ گائی گئی۔ اس میں ایک تیور ہے للکار ہے لیکن پھر بھی وہ عوامی اسلوب اور لہجہ نہیں
ہے جو عموماً اس نوع کی عوامی انقلابی شاعری کا ہوا کرتا ہے۔ یہ مصرعہ دیکھئے ؎

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے

تاہم اس نظم نما قوالی نے پاکستانی سرزمین پر عوامی سطح پر ہنگامہ برپا کیا
اور ایک نئے فیض کا صبح کاذب کی طرح ظہور کیا اور پھر صبح کاذب' صبح صادق
میں بدل گئی۔ اور وہ غزل کے بجائے ترانہ لکھنے بیٹھ گئے۔ ترانہ اور قوالی کا
تعلق عوام سے ہوتا ہے اس میں وہ کہہ اُٹھے ؎

اے خاک نشینوں اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

اب مزاحمت میں انقلاب کا لہجہ آ گیا ــــــ خاک نشینوں سے عام اور راست
خطاب، تخت و تاج کے خلاف صدائے احتجاج، سر اور بازو کے کٹا دینے کا انداز، ڈیرہ
اور منزل تک پہنچنے کا مزاج ــــــ اور پھر اس میں یقین و اعتماد اور لہجہ میں چمک اور
کھنک' وہ دھیما پن جس کے لئے فیض شہرت رکھتے ہیں ان اشعار میں نہیں ملے گا اور
مل بھی نہیں سکتا کہ صحیح معنوں میں احتجاجی و انقلابی شاعری کا یہی انداز و آہنگ ہوتا
ہے'' کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو'' کا انداز'' کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی'' سے
بہر حال مختلف ہے کہ مزاحمت اس میں بھی ہے لیکن نگارِ صبا اور دستِ صبا کی ترکیبوں
نے احتجاجی شاعری کے حوالے سے اعتراضات کے کئی در کھول دئے تھے کہ یہ

ترکیبیں واصطلاحیں عوامی ہرگز نہیں ہیں جبکہ بات عوام کی ہی ہو رہی ہے۔شاید اسی لئے اگلے مجموعہ کا نام زنداں نامہ رکھا گیا لیکن اس درمیان یہ تو ہوا کہ دستِ صبا کی نظموں جس میں ایرانی طلباء کے نام، نثار میں تیری گلیوں، شیشوں کا مسیحا زنداں کی ایک شام، وغیرہ نے پوری اردو شاعری کو بالعموم اور ترقی پسند شاعری کے معیار و مذاق کو بدل کر رکھ دیا۔زنداں نامہ کے دیباچہ میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے

''میرا خیال ہے کہ اردو ادب کا جدید دور اس کے روشن ترین ادوار میں سے ہے۔ یہ دور تقریباً ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے ابھی تک جاری ہے اور اگر ہم گذشتہ چار پانچ سال کو ہی لے لیں تو میرے خیال میں فیض کی دستِ صبا اور زنداں نامہ، ندیم قاسمی کی شعلۂ گل، سردار جعفری کی پتھر کی دیوار وغیرہ اس دعوے میں کافی ہیں کہ تخلیق کا سُرخ شعلہ جس میں گرمی بھی ہے حرکت بھی اور توانائی بھی.......''

فیض کی احتجاجی وانقلابی شاعری میں اس وقت مزید توانائی پیدا ہونے لگتی ہے جب وہ پاکستان کی سرحدوں سے نکل کر عالمی سیاست کو سمجھنے لگتے ہیں اور دنیا کے انقلابی شاعروں کو پڑھتے ہیں اور اُس عہد کے انقلابی شاعروں سے دوستانہ مراسم بھی قائم ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۰ کے درمیان فیض کے دو شعری مجموعے دستِ تہہ سنگ اور سرِ وادیٔ سنیا شائع ہوئے۔ دونوں مجموعوں کی شروعات ہی انقلابی نظموں سے ہوتی ہے۔'' آج بازار میں پابہ جولاں چلو۔''اور سرِ وادئی سینا کا تو انتساب ہی ہے ۔

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

اردو شاعری میں غم کے تذکرے تو خوب رہے لیکن غمِ عشق کے زیادہ تھوڑے بہت غمِ حیات کے بھی لیکن پہلی بار مزدور، کلرک، پوسٹ مین، دُکھی مائیں، بیوائیں اس انقلابی انداز سے شاعری کا حصہ بنیں۔ سب کو غم سے منسوب کیا اور پھر یہ بھی کہا ۔

غم نہ کر غم نہ کر
درد تھم جائے گا غم نہ کر غم نہ کر
زخم بھر جائے گا غم نہ کر غم نہ کر

ماسکو گئے تو یہ سوچا ـــــ

اک ذرا سوچنے دو
کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا
گل کی شہہ رگ پہ کڑا
وقت پڑا
سوچنے دو

اور فیض کی سوچ پھیلتی چلی گئی جونرودا، حکمت درویش برگ اور سارتر تک پھیل گئی۔
سارتر سے ایک ملاقات میں ایک سوال بھی کیا۔ ''بڑا ادب کیا ہوتا ہے؟'' جواب تھا ۔

''بڑا ادب پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ کوئی ہمت آفریں شجاعانہ موضوع چاہئے جس میں انسان اپنے سے کسی بڑی طاقت سے نبرد آزما ہوئے اب یونانی زمانے کے دیوی دیوتا اور ان کے کارندے نہیں رہے جن سے پرانے زمانے کے ہیرو نبرد آزما ہوتے تھے اب تو یہ تصادم مادی، معاشرتی اور سیاسی طاقتوں کے خلاف ہو سکتا ہے۔''

سارتر سے ہی ایک سوال اور تھا ___ ''آپ کے نزدیک عاشقانہ یا غنائیہ ادب کا بھی کوئی مقام ہے یا نہیں؟''

جواب ملاحظہ کیجئے ___

''ہے کیوں نہیں وہ تو ہر دل کا ایک فطری تقاضا ہے جس کی تسکین لازم ہے لیکن وہ تو ایک پگڈنڈی ہے شاہراہ نہیں۔ ادب کی شاہراہ کو جو کسی دور میں ایک منزل سے اگلی منزل تک لے جاتی ہے۔ اس دور کی ذہنی، فکری اور اخلاقی افق پر پوری طرح محیط ہونی چاہئے ورنہ بات آگے نہ بڑھے گی۔ آج کل کا ادیب اگر انسانی معاشرے کی تاریخ اور معاشیات کی جدلیات سے بے بہرہ ہے تو ہم عصر حقائق کے بارے میں اس کا جذباتی اور جبلّی ردِ عمل خواہ کتنا ہی صحیح ہو اسے باہر کی دنیا تو کیا اپنے اندر کی دنیا کے کھرے کھوٹے کا بھی پورا اندازہ نہ ہو سکے گا اور تذبذب اور بے یقینی اس کی تحریروں میں بھی ملے گی۔''

ہمارے بعض جدید دانشوران جو سارتر کے فلسفۂ وجودیت پر گہرا یقین رکھتے ہیں ان تحریروں کو بغور پڑھنا اور سمجھنا چاہیے کہ وہ اکثر فلسفۂ وجود کے بجائے عدم وجود کی طرف چلے جاتے ہیں اور زندگی کی کتاب کے بجائے موت کی کتاب لکھ جاتے ہیں۔

بڑے انقلابی شاعروں اور شاعری کے مطالعہ نے فیض کے ذہن اور وژن کو مزید وسعت اور جہت بخشی۔ ان کی شاعری کا تیور بھی بدلتا گیا اور یہ احساس بھی کہ شاعر صرف شاعر نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کا ضمیر ہوتا ہے اس کا نظریہ پیغمبرانہ بھی ہونا چاہئے۔ سرحدیں ختم ہوتی ہیں۔ پورے عالم کا انسان اور اس کا غم اس کا موضوع ہو جاتا ہے اور جب یہ غم محض اظہارِ غم تک نہ رہ جائے۔

جامِ تخلیق میں درد تہہ جام بن کر نہ رہ جائے بلکہ لبِ جام آ جائے تو پھر مزاحمت احتجاج میں اور احتجاج انقلاب میں تبدیل ہونے لگتا ہے اور فیض کو یہ احساس ہوا کہ اس نوع کی شاعری کے لیے دھیما پن ضرر رساں ہے۔ سرگوشی اور نغمگی اس کی شریعت میں نہیں۔ فیض کا پہلے لہجہ یہ تھا۔

ہم کیا کرتے کس رہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
جس راہ چلے جس سمت گئے
یوں پاؤں لہولہان ہوئے

اور اب یہ آہنگ ہوا ___

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جن کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم وستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

___

اس نظم میں کیا کرتے کس رہ چلتے کی تشکیک ختم ہوگئی اور وہ ''لازم ہے

کہ ہم بھی دیکھیں گے'' کے یقین میں بدل گئی ــــــ اور یہ لازم کا لفظ محض شعر کی داخلی ساخت میں حُسن نہیں پیدا کر رہا ہے بلکہ ایک اعتماد اور یقین کا احساس دلا رہا ہے نیز یہ بھی کہ دستِ صبا اور نگار صبا کی غنائی شاعری میں دھڑ دھڑ اور کڑ کڑ کی صدا سنائی دینے لگتی ہے جو بظاہر فیض کے رومانی شعری آہنگ سے میل نہیں کھاتی لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ احتجاجی وانقلابی شاعری کا آہنگ رومانی شاعری کے آہنگ سے مختلف تو ہوتا ہی ہے اور یہ بات اب فیض بھی اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے اور یقیناً مارکس کا یہ خیال بھی ان کے ذہن میں رہا ہوگا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں یوں تو بڑی خرابیاں ہوتی ہیں لیکن اس کے ذریعہ ایک عوامی کلچر، احتجاجی شاعری اور عالمی ادب کا پیدا ہونا بھی لازمی ہے۔ فیض کا یہ لازم اسی کی طرف بلیغ اشارہ کرتا ہے۔ اسی سے طمانیت کا لہجہ بھی جنم لیتا ہے۔

ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

اس میں ''ہم جانیں'' کا استعمال ایک احتجاج بھی ہے اور للکار بھی جو مزاحمت کے ضمن میں ایک نئے تصورِ جمال کو جنم دیتا ہے۔

اس دور کی شاعری میں جتنی اذیتیں ہیں اتنی ہی وسعتیں بھی۔ اس کا دائرہ پھیل جاتا ہے اور موضوعات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ دنیا کا انسان مفلس، مظلوم سب دائرے میں آجاتے ہیں۔ ۱۹۶۲ میں جب انھیں لینن انعام ملا۔ تو تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ــــــ

''انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار

رہی ہیں ۔ یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی و زوال،
روشنی اور تیرگی انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی
قوتیں ___ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں آدم
کی بقا اور فنا ___ مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے
اپنے دشمنوں سے آج تک ہار نہیں مانی اب بھی فتح
یاب ہو کر رہے گی ___''

کارل مارکس نے بھی صرف اپنے ملک یا مغرب کو متوجہ نہیں کیا بلکہ دنیا کے مزدوروں کو ایک ہونے کی ترغیب دی۔

فیض نے بھی کہا ؂

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر	پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو	نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
ان دونوں میں رن پڑتا ہے	نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں	ہر چلتی راہ کے ماتھے پر
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں	وہ آگ بجھاتے پھرتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو	اس رن سے بلاوے آتے ہیں

تصورِ انقلاب یا فلسفۂ انقلاب کو سمجھے بغیر کچھ لوگ فیض کی اس نوع کی شاعری کو کمزور اور غیر ادبی کہتے رہے لیکن سچ یہ ہے کہ فیض کو مکمل فیض اور بڑا فیض اور خواص و عوام میں مقبول و ہر دل عزیز فیض اسی نوع کی شاعری نے ہی بنایا۔ آخری دور کی شاعری یا احتجاج و انقلاب پر فیض شرمندہ نہیں ہیں اور نہ ہی ترقی پسند ادیب و ادب۔ فیض کی نرم مزاجی یہاں بھی کوئی دعویٰ نہیں کرتی بلکہ یہی کہتی رہی۔

اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے وہ گذری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار
جنھیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے

وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے

ان سب پہلوؤں کے ذریعہ فیض نے اپنی شاعری میں دھار پیدا کی جو بعد کی شاعری میں تلوار بن کر چمکی اور جو احتجاجی شاعری کا کمال بنی۔ جلال اور جمال بھی اور ایک خاص قسم کا یقین اور اعتماد بھی تبھی تو شاعر کہتا ہے ؎

ہم جیتیں گے
حقا! ۔ ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

اور یہ بھی ____

اٹھے گا جب جمع سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

زندگی کی آخری غزل اور آخری سانس تک یہی احساس رہا ؎

بہت ملا نہ ملا زندگی سے غم کیا ہے
متاعِ دردبہم ہے تو بیش و کم کیا ہے
کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مصرف
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشمِ نم کیا ہے

نقشِ فریادی سے لے کر غبارِ ایام تک فیض کا تخلیقی سفر بغور ملاحظہ کیجئے۔

صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں نہ دار ورسن ہے نہ احتجاج و انقلاب ۔ انسانی درد ہے اور ہلکا سا احتجاج بھی لیکن جیسے جیسے ان کا ذہنی وفکری سفر آگے بڑھتا گیا تو جمال جلال میں بدلتا گیا اور آخری دور کی شاعری میں بطور خاص یہی ان کی شناخت بن گیا اور یہی مکمل شناخت ہے فیض کی جسے محض عشقیہ شاعر، غنائی شاعر یا دھیمے لہجے کا شاعر، اس کے جمالیاتی ، نظام پر عالمانہ و ناقدانہ گفتگو کر کے مکمل نہیں کہا جا سکتا ایک شاعر و فنکار کی زندگی میں فکر ونظر کے کئی پڑاؤ آتے ہیں عمر کے آخر میں وہ اپنے مکمل اتحاد فکر وفن کے ساتھ شاعری کرتا ہے اور قاری یا ناقد اپنی پسند و ناپسند یا نقطہ نظر کے ساتھ اسے قبول کرتا ہے ۔ اس قبولیت میں اس کا اپنا ایک رویہ و نظریہ تو ہو سکتا ہے لیکن کُلیہ نہیں ۔ میرا خیال ہے کہ مکمل فیض کو اس وقت تک سمجھا ہی نہیں جا سکتا جب تک ان کی احتجاجی و انقلابی شاعری اور اس کی شعریات و جمالیات کو نہ سمجھا جائے اب یہ الگ بات ہے کہ ہمارے قدماء و علماء نے جو شعریات قائم کی ہے اس کا بیشتر دار و مدار عشق و محبت، حسن و جمال پر ہے ____ صوفی شعراء نے اس میں عشقِ انسانی کے رنگ ضرور بھرے لیکن کچھ اس غزلیہ و رمزیہ انداز سے کہ عشقِ مجازی و حقیقی کا فرق آسانی سے محسوس نہیں کیا جا سکتا ۔ سماجی و احتجاجی شاعری کے پیمانے ہم نے بنائے ہی نہیں چہ جائیکہ انقلابی شاعری ۔ اسی لئے ہم فیض کی انقلابی شاعری اور پوری ترقی پسند شاعری کو نعرہ بازی ۔ خطابت و خارجیت اور نجانے کس کس انداز سے لعن طعن کرتے رہے اور اپنے گراں قدر سرمایے کو رد کرتے رہے جیسے ہم نے ابتداً کبیر و نظیر کو رد کیا لیکن ہم بھول گئے کہ دنیا کے ہر ادب میں انقلابی شاعری ہوئی ہے اور اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے ۔ اردو میں بھی جن لوگوں نے اس نوع کی شاعری کو پڑھا اور سمجھا ہے انھوں نے اس کی حقیقت ، ماہیت اور خدمت کا اعتراف کیا ہے ۔ سردار جعفری نے فیض کے حوالے سے ہی لکھا ہے ۔

طپش کی آتش جرّار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ

یہ جو آھنگ ہے یہ فیض کا انقلابی آھنگ ہے جو اس عہد کا آھنگ ہے جو دنیا کے ہر شاعر کے یہاں آپ کو مشترک ملے گا۔ یا بلونرودا کے یہاں ناظم حکمت کے یہاں لوئی آراگاں، سویت یونین کے شعراء کے یہاں لیتن امریکہ کے شعراً کے یہاں، عرب شعراً کے یہاں یہ آھنگ ہے اور یہ اس عہد کا آھنگ ہے اس لیے کہ یہ ساری انسانیت کی جدوجہد کا آھنگ ہے۔

''فیض بڑے شاعر ہیں اگر اس کا معیار یہ ہے
کہ ان کی شاعری بے حد حسین ہے تو یقیناً کوئی
دورائے نہیں ہوسکتی۔ فیض بڑے شاعر ہیں کہ انھوں
نے نیا انقلابی آھنگ دیا ہے اور اس آھنگ میں
پورے ایشیاء پورے عرب اور پوری دنیا کی تحریک
آزادی شامل ہو جاتی ہے۔''

عہدِ حاضر کے ممتاز مفکر و دانشور اعجاز احمد نے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

''یہ میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلی بار موقع ملا تھا کہ وہ
ناظم حکمت ہوں اور ترکی میں لکھتے ہوں یا پابلو مزودا ہوں'
اور اسپنیش میں لکھتے ہوں یا این سیریں ہوں فرنچ میں
لکھتے ہوں وہ سب بین الاقوامی احتجاجی ادب کی تحریک
کے ممبر تھے کارکن تھے۔ کون بڑا ہے کون چھوٹا ہے اس کی
کیا شکل ہے اس کی کیا جمالیات وغیرہ۔ یہ بھی میرے
لیے دلچسپی کی بات ہے کہ احتجاجی ادب میں شاعری نیں
آپ کو ہمیشہ ملے گی لیکن شعوری طور پر ایسی کہ اس کی اپنی
اپنی زبانوں میں اپنے اپنے ملکوں میں ایک ساتھ جوڑ کر
بین الاقوامی متحدہ جمالیات کے طور پر آپ بنا پائیں پہلے
ایسا نہ تھا میرے خیال میں یہ بہت ہی اہم بات ہے کہ

جس چیز کو ہم احتجاجی ادب کہتے ہیں اس ادب نے کہا کہ
اصل ادب ہمارا ہے اور ہم تمہیں یہ طے کر کے دکھائیں
گے کہ زبان کی جو سب سے اچھی شاعری ہے جو سب
سے اچھا ادب ہے ہمارا ہے۔''

یوں تو ادب میں ہمیشہ ہی اضطراب و احتجاج کی لہریں رہی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج کے ادب میں جو اضطراب و احتجاج کے نمایاں دھارے ہیں اور جو اس کی مختلف شکلیں ہیں اور اس کی حدت ہے حرکت و حرارت ہے وہ عالمی شاعری کے احتجاج کی بالعموم اور ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر احتجاجی شاعری کی بالخصوص دین ہے جس میں فیض کی اپنی منفرد پہچان ہے۔ یہ انفرادیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ فیض نے اپنی رومانی و انقلابی شاعری کی ایک الگ شناخت قائم کی ہے اور ہر بڑے شاعر کی شاعری ایک الگ قسم کی شعریات کا مطالبہ کرتی ہے لیکن ہمارے بیشتر ناقدین ایک ہی شعریات کی پٹری پر مختلف مزاج و مذاق کے شاعروں کو دوڑاتے رہے ہیں خواہ وہ میر ہوں غالب ہوں یا فیض۔ جبکہ سب الگ الگ دبستان فکر و شعر کے فنکار ہیں۔

فیض کو عموماً رومانی شاعر کہا جاتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ فیض کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ایک اکیلی روایتی رومانی شعریات ناکافی ہے فیض روایتی شعریات سے متاثر ضرور ہیں لیکن انھوں نے اپنے تخلیقی سفر اور ارتقائی فکر و نظر میں اپنے آپ کو اس سے مختلف بھی کیا ہے یہ اختلاف اس لیے بھی ضروری تھا کہ روایتی شاعری میں بقول شمس الرحمٰن فاروقی .....'' غزل کے مضمون میں زیادہ تر محرومی نارسائی اور ناکامی کے مضامین ہوتے ہیں ____ '' لیکن فیض کی رومانیت میں آزادی، خوشحالی اور منصفی کے عناصر زیادہ ہیں، فیض نے ایک نئی شعریات کو جنم دیا اور اس کے ذریعہ ملک، سماج کے سنجیدہ سوالات میں جمالیات کے عناصر بھر دیئے۔ انسانی اور اشتراکی جمالیات، خالی یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ فیض کا معشوق کبھی انسان ہے اور کبھی وطن، اصل بات یہ ہے کہ وہ روایتی اُداسی اور

مایوسی کو امید و نشاط اور آرزو میں بدل کر تاریخ کے اس موڑ پر کھڑا کر دینا چاہتے ہیں جسے انقلاب کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔ فیض نے ایک نئی انقلابی جمالیات کو جنم دیا۔

فیض کی شاعری نصابی کلاسیکی اور روایتی مزاج کی شعریات میں فٹ ہی نہیں کہ یہاں ذات کے مسائل، عشق و محبت کے روایتی مصائب ہیں ہی نہیں۔ یہاں ذات کائنات میں بدل گئی ہے اس لئے بڑے سے بڑے جدید اور مابعد جدید نقاد فیض کے متن کو طرح طرح سے کھنگالیں اور ہدایت دیں کہ فیض کو ایسے پڑھیں اور ایسے نہ پڑھیں لیکن وہ اصل فیض کو پرکھ ہی نہیں سکتے اگر ان کے ذہن میں سماج اور بدلتے ہوئے سماج۔ انسان کے دکھ درد کا احساس و شعور نہیں ہے۔ المیہ یہی ہے کہ ناقد کے پاس اکثر دماغ تو ہوتا ہے دل نہیں ہوتا۔ آج تو ہوتا ہے کل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بنائے ہوئے اصولوں سے جانچتا پرکھتا ہے جبکہ فن کو فنکار کے حوالے سے جانچنا چاہئے سخت گیر نقاد اپنے نقطۂ نظر سے ادب کو دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے بلکہ کائنات کو بھی چلانا چاہتا ہے جو ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے اکثر وہ اپنی ذات کے بھنور میں گھر کر لہولہان ہو جاتا ہے اور بڑا شاعر اپنے رنج و غم اور جدوجہد کی چٹان پر کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔

فیض اور اقبال

فیض اور اقبال دونوں ہی بیسویں صدی کے ایسے اہم شاعر ہیں جن کے بارے میں تقریباً ہر زاویے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بے پناہ اور غیر معمولی سرمایۂ نقد ہونے کے باوجود ایک ہلکا سا یہ احساس ہوتا ہے کہ اقبال کی فکر پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ فن پر کم۔ اس کے برعکس فیض کے فن اور اسلوب پر زیادہ لکھا گیا ہے فکر پر نسبتاً کم۔ اس خیال سے اتفاق ہو سکتا ہے اور اختلاف بھی بہر حال موضوع بحث طلب ہے اور شاید تحقیق طلب بھی۔ اس پر باتیں کبھی کسی دوسرے مضمون میں ہوں گی۔ زیرِ قلم مضمون میں اقبال کے تئیں فیض کی قربتیں، عقیدتیں اور پھر آگے بڑھ کر شعوری یا لاشعوری دوریوں اور نزدیکیوں پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے کہ فیض کو اس زاویہ سے کم دیکھا گیا ہے۔

فیض اور اقبال کی قربتوں کی پہلی صورت تو یہی ہے کہ دونوں اردو زبان کے ایسے شاعر ہیں جو ایک شہر ایک صوبہ اور سرزمین پر پیدا ہوئے۔ دونوں کا وطن سیالکوٹ تھا۔ تعلیم لاہور میں ہوئی۔ اساتذہ بھی تقریباً ایک۔ ماحول اور حالات بھی تقریباً ایک۔ فرق یہ تھا کہ فیض گاؤں میں پیدا ہوئے اور اقبال شہر میں۔ دونوں کی عمر میں بھی فرق تھا۔

(اقبال فیض سے تقریباً چونتیس سال بڑے تھے) یہی وجہ ہے کہ جب فیض نے شاعری کی ابتدا کی تو اس وقت اقبال کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ایک عظیم اور آفاقی شاعر کی حیثیت سے ان کی شناخت قائم ہو چکی تھی ۔اس لئے فیض کا اقبال سے متاثر ہونا عین فطری تھا لیکن فیض تو شاعر بننے سے قبل ہی یعنی بچپن سے ہی اقبال سے واقف ہو چلے تھے اور مرعوب بھی ۔فیض کے والد سلطان خاں اقبال کے دوستوں میں تھے۔فیض ابھی بچہ ہی تھے کہ سیالکوٹ کی کسی محفل کہ جس میں اقبال بھی موجود تھے ،فیض نے قرأت کی۔ بچہ کی قرآت سے اقبال اس قدر متاثر ہوئے اسے گود میں اٹھالیا۔شاباشی دی۔ فیض نے اس یادگار واقعہ کو کئی جگہ لکھا ہے۔ایک انٹرویوں کے سوال کے جواب میں فیض کہتے ہیں ۔

''جی ہاں اُن (اقبال) سے کئی مرتبہ شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ ایک تو وہ میرے ہم وطن تھے دوسرے میرے والد کے دوست بھی تھے۔ دونوں ہم عصر تھے۔ چنانچہ اُن سے پہلی ملاقات تو مجھے یاد ہے بہت بچپن میں ہوئی تھی جب کہ میری عمر چھ سات برس کی ہوگی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سیالکوٹ میں ایک انجمن اسلامیہ تھی۔ اُس کا ہر سال جلسہ ہوا کرتا تھا۔ انجمن اسلامیہ اسکول بھی تھا۔ دو تین اور اسکول تھے اور وہاں کبھی کبھی علامہ اقبال ان کے سالانہ جلسوں میں شرکت کے لئے آیا کرتے تھے۔ پہلی دفعہ تو میں نے انھیں انجمن اسلامیہ کے جلسے میں دیکھا۔ مجھ کو اس جلسے میں شرکت کا موقع اس لئے دیا گیا تھا کہ میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسلامیہ اسکول میں مجھے قرأت سُنانی تھی۔ مجھے کسی نے اُٹھا کر میز پر کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے قرأت سنائی

لوگوں نے پسند کی علامہ نے مجھے گود میں اُٹھالیا اور کہا تم تو
بہت اچھے بچے ہو۔''

ایک واقعہ اور ہوا۔ فیض سیالکوٹ میں ابتدائی تعلیم ختم کر کے جب اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور گئے تو گورمنٹ کالج میں داخلہ کے لئے اقبال کا ہی سفارشی خط لے کر گئے۔ داخلہ تو ہو گیا لیکن پرنسپل نے وہ خط رکھ لیا جس کا فیض کو قلق رہا کہ وہ خط آج ہوتا تو بڑے کام کا ہوتا۔ اسی کالج میں ایک سال سالانہ مشاعرے میں اقبال تشریف لائے۔ فیض لکھتے ہیں۔

''ہماری طالب علمی کے آخری دن تھے۔ گورمنٹ
کالج کے سالانہ مشاعرے میں پھر ایک مقابلہ ہوا تھا۔
موضوع دیا گیا تھا۔ ''اقبال'' اس پر بھی ہمیں انعام ملا تھا۔
صوفی تبسم صاحب نے ہم سے کہا..... ''تم بھی نظم سنادو''
تو ہم نے کہا تھا... ''علامہ اقبال کے سامنے تو ہم نظم نہیں
سُناتے۔'' صوفی صاحب نے کہا ''نہیں نہیں ٹھیک ہے
بہت اچھی نظم ہے پڑھ دو'' چنانچہ وہ نظم ہم نے پڑھ دی۔''

یہ واقعہ جنوری ۱۹۳۱ء کا ہے۔ فیض کی یہ نظم بیحد پسند کی گئی اور اوّل قرار پائی۔ بعد میں یہ نظم کالج کے مجلّے راوی میں شائع بھی ہوئی۔ روسی اسکالر لُدمیلا واسی لیوا نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

''محولہ بالا نظم ''اقبال'' فیض کے نہایت قریبی
دوست اور ہم خیال صحافی سبط حسن کے کاغذات میں
محفوظ رہ گئی۔ انھوں نے ۱۹۶۵ء میں نظم کا یہ واحد نسخہ افکار
کے فیض نمبر میں دیدیا۔''

اقبال سے متعلق فیض کی وہ نظم جو اقبال کی موت کے بعد کہی گئی وہ نقش فریادی میں ضرور ملتی ہے لیکن آٹھ نو سال قبل طالب علمی کے زمانے کی یہ نظم (اتفاق سے دونوں کا

عنوان ایک ہی ہے) نایاب ہوگئی۔ فیض کے کلیات نسخہ ٔ ہائے وفا میں بھی نہیں ملتی۔ بعد میں جب ایک دوسرا کلیات سارے سخن ہمارے شائع ہوا تو باقیاتِ فیض کے تحت یہ نظم شامل اشاعت ہوئی۔ محض بیس سال کی عمر میں کہی گئی اس نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

زمانہ تھا کہ ہر ایک فرد انتظار موت کرتا تھا
عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں

اور ختم ہوتی ہے اس شعر پر ؎

طلسمِ کن سے تیرا نغمہ ٔ جاں سوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا

اور ذرا اس بند میں تفہیم اقبال کی یہ کیفیت و بلاغت ملاحظہ کیجئے ؎

نبود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے
ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے
ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے
ہر اک ذرّے کو ہمدوشِ ثریّا کر دیا تو نے

اس سے یہ اندازہ تو ہوتا ہی ہے کہ فیض اتنی کم عمری اور نوجوانی میں شعر و شاعری کا کیا معیار اور تصور رکھتے تھے جو شاعر محض بیس سال کی عمر میں ایام جوانی میں راز ہائے بود و نبود کو سمجھے۔ قطرے کو دریا اور ذرّے کو ہمدوش ثریا کے حوالے سے اقبال کو خراج پیش کر رہا ہو اس سے عظمتِ اقبال پر روشنی تو پڑتی ہی ہے خود فیض کے شعورِ فکر و فن کا بھی اندازہ ہوتا ہے - ابتدأ مزاج و عمر کے تقاضوں کے تحت وہ عشقیہ شاعری کے رنگ میں شرابو ضرور تھے تاہم ان کے چار مصروں کو ملاحظہ کیجئے جس سے ان کی شاعری یا نقشِ فریادی کی ابتدا ہوتی ہے ؎

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

ان مصرعوں میں رات، بیمار، صحرا، قرار وغیرہ کو بغور محسوس کیجئے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب کہ سب اس عہد کی سُبک رومانیت کو کس طرح سنجیدہ رُخ دینے کے لئے بیقرار تھے۔ فیض نے کئی جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ محمد دین تاثیر، صوفی تبسم، عبدالمجید سالک وغیرہ کے ساتھ وہ کئی بار اقبال سے ملے لیکن سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کی ملاقات بڑا کام کر گئی۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو نے بقول فیض...... چودہ طبق روشن کر دیے..... اور فیض کی رومانیت کو ایک حقیقی راہ مل گئی۔ ایک نظریہ اور ایک پلیٹ فارم اور نقشِ فریادی کی ابتدا میں ہی وہ کہہ اٹھے

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

یا

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

فیض کی زندگی میں ایک فیصلہ کن موڑ آیا ..... ایسے موڑ اقبال کی زندگی میں بھی آئے۔ مغرب کے سفر نے مشرق کا عرفان عطا کیا۔

اب اقبال اور فیض کا سرمایۂ فکر و شعر ہمارے سامنے ہے۔

دونوں کے بارے میں ناقدین اور شائقین کی ایک رائے بن گئی ہے۔ دونوں کو بیسویں صدی کا مقبول، پسندیدہ اور بڑا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ آگے بڑھ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اقبال جوش اور فیض اس صدی کے سب سے باعمل اور بامقصد شاعر کے طور پر تسلیم کئے گئے ہیں۔

اقبال اور فیض دونوں ایسے شعراٗ ہیں جنھوں نے فکر و فن کے امتزاج کو بہتر ڈھنگ سے ڈھالا ہے۔ فلسفہ کو شاعری (اقبال) اور نعرہ کو شاعری (فیض) کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ یہ درس یہ شعور دونوں کی شاعری سے ملتا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ دونوں آرزو۔ خواب، حقیقت اور حکمت کے شاعر ہیں۔ دونوں ہی بہتر اور صحت مند

معاشرہ اور زندگی کا تصور رکھتے ہیں۔ ایک نے فلسفہ کو شاعری بنا دیا تو دوسرے نے شاعری کو فلسفہ بنا دیا۔ پاکستان کے ایک ادیب ریاض قدیر نے ایک جگہ لکھا ہے ۔

''فیض کا مزاج اقبال سے مختلف تھا۔ وہ فکر اقبال سے ذہنی ہم آہنگی نہ رکھتے تھے۔ وہ اقبال سے جذباتی طور پر متاثر نہ تھے اور نہ کبھی اقبال سے ان کا تعلق خاطر پیدا ہو سکا۔ انھوں نے اقبال پر جو دو نظمیں کہی ہیں ان میں اقبال کی شخصیت کے ساتھ شاعر کی کسی جذباتی وابستگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں نظمیں اقبال کی قومی اور شعری خدمات کو رسمی خراج تحسین پیش کرتی ہیں۔''

یہ باتیں کسی حد تک دُرست ہو سکتی ہیں لیکن رسمی خراج تحسین کی بات مناسب نہیں لگتی۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کے تئیں تمام قربتوں اور عقیدتوں کے باوجود کچھ فاصلے تھے۔ ایک تو عمر کا فاصلہ، احترام وعقیدت کا فاصلہ تاہم یہ نظمیں ہرگز رسمی نہ تھیں اور نہ ہی اقبال پر لکھے گئے فیض کے ایک نہیں دو تین مضامین۔ ان سب میں سچا جذبہ فکر کا مخلصانہ اور دانشورانہ احساس و اظہار ملتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ دونوں کی مزاجی کیفیت اور افتادِ طبیعت میں بُعد وفرق تھا جو عموماً ہوا کرتا ہے۔

ایک قابلِ غور نکتہ یہ بھی ہے کہ دونوں ابتداً رومانیت سے متاثر تھے۔ کچھ یہ بھی تھا کہ رومانیت اس زمانے میں انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر نیا نیا احساس بن کر اردو شعروادب میں داخل ہوئی تھی۔ یہ دونوں ہی اردو کے وہ ابتدائی شاعر ہیں جنھوں نے انگریزی ادب اور مغربی ادب کا سنجیدہ مطالعہ کیا تھا۔ اس عہد کے اردو شعرأ پر اس نئی رومانیت کے اثرات بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال، فیض کے علاوہ اختر شیرانی حسرت موہانی، جوش، حفیظ وغیرہ نے اسے ایک نیا رنگ اور طرز احساس دے رکھا تھا۔ اسی کے حوالے سے فطرت نگاری ایک نئے ذوق اور قوس کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تھی جو نظیر اور انیس سے خاصی مختلف تھی۔ اقبال کی ابتدائی نظموں کو ملاحظہ کیجئے تو ان میں

صاف نظر آئے گا کہ فطرت کے ساتھ آرزو اور حقیقت بھی جھانکتی نظر آئے گی (بعض نظمیں تو براہ راست ٹینی سن اور ایمرسن کی رومانی نظموں کا ترجمہ ہیں) یہی جذبہ تو آگے بڑھ کر خضرِ راہ جیسی نظموں میں ایک زاویہ پھر فلسفہ بن جاتا ہے جہاں شام کے دھندلکے میں سپیدئ سحر کی تلاش ہے اور اسرارِ حیات کو بے نقاب کرنے کی للک دکھائی دیتی ہے۔فیض نے بھی فطرت سے فیض حاصل کیا ہے لیکن انداز جداگانہ ہے۔مختصر نظمیں کہنے کے مزاج کی وجہ سے ان کے اکتسابات بھی چھوٹے پیانے پر ہیں تاہم ان کی شاعری میں صبا، بہار، گلشن، نجوم، دریچہ وغیرہ جس پُرکشش اور پُر اثر انداز میں جذب و پیوست ہوئے ہیں اور ان کی معنی خیزی اور اثر انگیزی شاعری کے کلیدی استعارے کی شکل اختیار کر گئے ہیں کہ وہ آخر تک فیض کی شاعری میں سموئے رہتے ہیں البتہ اقبال کا شعری وارتقائی سفر فکر وفلسفہ کی ایسی وسعتیں اختیار کرتا چلا جاتا ہے جہاں جغرافیائی فطرت پہلے انسانی فطرت۔اس کے بعد فکرِ حیات اور پھر فلسفہ کائنات میں ڈوب جاتی ہے اور سُبک رومانیت گہری حقیقت میں تبدیل ہو کر ایک لافانی انسانی فلسفۂ حیات وممات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اسی طرح فیض نے بھی اس عہد کے سب سے بڑے فلسفہ اشتراکیت سے آنکھیں ملانے کے بعد نقشِ فریادی کے ایک بڑے حصہ کا یہ عنوان قائم کیا۔''دلے فرد ختم و جانے خریدم'' پھر دونوں کی شاعری ابتدائی نزاکتوں اور لطافتوں کو عبور کرتی ہوئی ایک بڑے مقصد سے آنکھیں ملانے لگتی ہے۔ ایسی آنکھیں جو غالب کی چشمِ بینا کا ارتقائی سفر بن کر ایک نئی نظر اور وژن کے اظہار کا وسیلہ بن جاتی ہے۔یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دونوں ہی غالب سے بیحد متاثر ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں فیض نے کہا تھا..........''اصل میں مطالعہ جسے کہتے ہیں وہ تو میں نے ایک ہی شاعر کا کیا ہے یعنی غالب کا.......''اقبال کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحوں میں بسترِ علالت پر تکیے کے نیچے صرف دو دیوان پائے جاتے تھے۔دیوانِ رومی اور دیوانِ غالب ......اسی لئے پاکستان کے ادیب ریاض قدیر نے اپنے ایک مضمون کی ابتدا ان جملوں سے کی ہے ۔

''اردو شاعری میں کلامِ غالب سے جس جدید طرز احساس کا آغاز ہوا۔ اقبال اور فیض کا کلام اس کی ترقی یافتہ صورت ہے .....تیز ترین سماجی تبدیلیوں سے دوچار ہوتے ہوئے انسانوں کے جذبات اور احساسات اور عصری شعور کو غالب کے بعد اقبال اور فیض نے ہی تخلیقی تجربے میں ڈھالنے کے بعد منظم فنی انداز میں پیش کیا۔''

ایک خونریز واقعہ اور زوال پذیر معاشرہ کو غالب نے اپنی حساس اور دوربیں نگاہوں سے دیکھا۔ کتنے لہولہان ہو گئے لیکن ظرفِ غالب نے حسرتِ تعمیر کی بنیاد ڈالی اور فکر غالب نے احترام آدمیت کو موضوع بنایا۔ قدامت سے باہر نکلے اور نئی زندگی کے خواب دیکھے۔ اقبال اور فیض نے اسی خواب کو حقیقت میں بدلنا چاہا۔ ایک نے اسلامی نظریہ کے حوالے سے دوسرے نے اشتراکی حوالوں سے۔ مشترک تھا انسانی حوالہ .....اسی لئے دونوں ہی زندگی کو صحت مند اور انسان کو ترقی پسند دیکھنا چاہتے تھے۔ دونوں کے یہاں جذبہ ہے۔ تڑپ ہے۔ اضطراب ہے اور کہیں کہیں احتجاج اور انقلاب بھی۔ اقبال کے یہاں کم اور فیض کے یہاں زیادہ۔ لیکن عمل، جدوجہد، حرکت و حرارت اور رجائیت دونوں کی شاعری کے خاص محور و مرکز ہیں۔

رجائیت کے حوالے سے یہ دو شعر دیکھئے ۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

(اقبال)

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

(فیض)

اب ذرا عمل کے حوالے سے دونوں کو دیکھئے ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

(اقبال)

کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل پہ ہی ڈالے جائیں گے

(فیض)

اور عزم و حوصلہ کو بھی ملاحظہ کیجئے

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

(اقبال)

اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھوں وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

(فیض)

اقبال اور فیض دونوں انسان دوست ہیں۔ ترقی پسند ہیں اور تغیر پسند بھی۔ فرق یہ ہے کہ اقبال فرد کی خودی کو بیدار کرنا چاہتے ہیں اور فرد کی اس بیداری کو اجتماعی بہبودی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور اجتماعی خیر کا تصور وہ قرآن سے لیتے ہیں اس کے برعکس فیض انفرادی سے زیادہ اجتماعی بیداری پر یقین رکھتے ہیں اور اجتماعیت کا تصور مذہب، تصوف وغیرہ سے آگے بڑھ کر اشتراکیت سے جوڑ دیتے ہیں۔ اقبال بیداری کے لئے اخلاقیات اور روحانیات سے رشتہ استوار کرتے ہیں۔ فیض بیداری اور حق داری کے لیے جدلیاتی مادّیت و ماہیت کے راستے پر جاتے ہیں جو آگے بڑھ کر احتجاج اور انقلاب کا راستہ اپنا لیتی ہے۔ یوں تو اقبال کو بھی یہ راستہ پسند ہے اور وہ مارکس و لینن کے نظریات کو نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ اپنی تفکیر و تخلیق کا حصہ بھی بناتے ہیں لیکن ان

کی حدیں ہیں اور فیض کی کوئی حد نہیں وہ سیاسی تقلیب کی آخری حد تک جانے کو تیار ہیں۔ ان تمام باتوں کے درمیان ایک عجیب بات یہ اُبھرتی ہے کہ ان سماجی و مزاحمتی صورتوں کو لے کر اقبال کہیں کہیں بلند آہنگی اور للکار کی لے اختیار کر لیتے ہیں اور ایک خیال ہے کہ اردو شاعری میں سیاسی معنوں میں انقلاب کا لفظ پہلی بار اقبال نے ہی استعمال کیا ہے اسی لئے ان کی شاعری میں کھیت، دہقان، روزی روٹی اور خوشۂ گندم کے جلا دینے کی للکار ملتی ہے۔ غم وغصہ کا اظہار ملتا ہے لیکن فیض مکمل اشتراکی و انقلابی شاعر ہونے کے باوجود ان کے مخصوص شعری آہنگ میں انقلابی آہنگ یا بلند آہنگی ان کی شاعری کا وصفِ خاص نہیں بنتی۔ اُن کے شعری امتیاز کے شناخت کا حصہ نہیں بنتی۔ عام طور پر فیض دھیمہ لہجہ کے شاعر، غنائی آہنگ کے شاعر کے طور پر جانے پہچانے گئے اور یہ خیال عام ہوا کہ اقبال کے یہاں خطابت زیادہ ہے تو فیض کے یہاں غنائیت زیادہ ہے جو فیض کی ایک مخصوص شناخت قائم کرتی ہے لیکن میرے نزدیک سوالیہ نشان قائم کرتی ہے (اس سوال اور اس موضوع پر گفتگو آئندہ مقالہ میں ہوگی) ان تمام چھوٹی بڑی تفریق کے باوجود دونوں میں مشترک یہ تھا کہ دونوں ہی بقول آل احمد سرور ...." دونوں شہنشاہیت کو ناپسند کرتے تھے۔ ہر قسم کے استحصال کو نا پسند کرتے تھے۔" اقبال نے خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں اسلام کو ایک قسم کا سوشلزم کہا ہے۔ فیض نے اپنی تحریر وتقریر میں صوفیوں کو اصل کا مریڈ کہا ہے۔ آل احمد سرور نے دونوں کے درمیان کے ایک فرق کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

> "فیض کے یہاں فکر کا محور تہذیب تھی۔ اقبال کے یہاں فکر کا محور مذہب تھا۔ مگر دونوں انسان دوستی، سرمایہ داری کی مذمت، مساوات اور عدل کی تلقین اور انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی سعی کی وجہ سے آفاقی شاعر ہیں۔"

عقل پرستی، انسان دوستی، رجائیت اور رومانیت کے ضمن میں اقبال اور فیض

ایک دوسرے سے بیحد قریب ہیں لیکن دونوں میں فاصلے بھی ہیں۔ اقبال کے مقابلے فیض کا دائرہ مختصر ہے۔ اقبال نے فارسی میں بھی شاعری کی اور بڑی طویل نظمیں کہیں لیکن فیض اختصار اور ایجاز کے شاعر ہیں۔ وہ نظمیں بھی مختصر کہتے ہیں۔ اقبال کی غزلوں میں بھی نظم کا مزاج داخل ہے فیض کی نظمیں غزلیہ انداز اور رچاؤ سے مملو ہیں۔ سرور نے لکھا ہے کہ اقبال کے یہاں غضب کی آمد تھی فیض بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے۔ ایک فرق کو اور یوں پیش کرتے ہیں ۔

''اقبال وہ دریا ہیں جو اپنے جلال سے پہچانا جاتا ہے فیض ایک جوئے خوش خرام ہیں۔ اقبال کا لہجہ بلند ہے اور بیحد پُر شکوہ۔ فیض کے لہجے میں نرمی اور شیرینی ہے۔ دونوں نے غنائی شاعری بھی کی ہے اور خطابت کے جوہر بھی دکھائے ہیں گو یہ بھی واقعہ ہے کہ فیض کے یہاں خطابت اقبال سے کم ہے۔''

اگر ایک طرف اقبال نے بہت سی لفظی ترکیبیں اور اصطلاحیں ایجاد کی ہیں مثلاً شاہین، انجم، لالۂ صحرا، شاعِ امید، علم و عقل وغیرہ تو دوسری طرف فیض نے بھی صبا، گلشن، دریچہ، مسیحا، تنہائی وغیرہ کو نئے ابعاد دیئے اور ایک جہانِ معنی سے روشناس کرایا۔ ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال اور فیض کے یہاں کچھ کلیدی الفاظ ہیں جس نے اپنے معنی خیز اور اثر انگیز تخلیقی استعمال سے ایک خاص شاعرانہ و مفکرانہ تصور قائم کر لیا ہے۔ اقبال اور فیض دونوں نے سیاسی شاعری بھی کی لیکن فیض نے سیاسی شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔ موڑ اس لیے بھی پیدا ہوا کہ وہ مقلد نہ تھے بلکہ خود انسان اور انسانیت، ثقافت اور سیاست کا ایک گہرا انسانی اور آفاقی تصور رکھتے تھے اس ضمن میں ان کا ایک ٹھوس نظریہ تھا۔ پختہ کمٹ منٹ تھا۔ فیض نے اس نظریہ اور نعرے کو اپنے تخلیقی تجربہ اور وجدان کے وساطت سے فنکارانہ استعمال کر کے اسے ایک منفرد اور دلکش آواز دی البتہ یہ ضرور ہے کہ مقصد اور پیام کے شعر میں ڈھلنے۔ شاعری بننے کی اپنی ایک ریاضت اور

عبادت ہوتی ہے۔ ذاتی تجربہ کائناتی تجربہ کا سفر کرتا ہے۔ پھر آفاقیت بھی کسی مقامیت، ارضیت اور ہمہ گیر تجربے کی مرہون منت ہوتی ہے۔ شاعری کا یہ لب ولہجہ بھی ذات اور کائنات کے درمیان سے جنم لیتا ہے۔ ایک حلقہ سے اگر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ فیض لب ولہجہ کے اعتبار سے وہ منفرد و مختلف لہجہ کیوں نہیں اختیار کر پائے جو راشد، میرا جی وغیرہ نے اپنایا۔ اوّل تو یہ سوال ہی بے بنیاد ہے اس لئے کہ اقبال اور فیض دونوں ہی اپنے منفرد لہجے اور آہنگ کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں مسئلہ کچھ اور ہے تو سوال یہ بھی ہے کہ کیا صرف اسلوبیاتی لہجہ کا انحراف ہی کسی شاعر کو بڑا بنانے کے لئے کافی ہے؟ فکر کی دبازت، احساس کی گھلاوٹ، اضطراب کی کیفیت ہی شاعر کو بُت شکن بناتی ہے اور بُت تراش بھی۔ اقبال ہوں یا فیض (یا کوئی بھی اہم اور قابلِ قدر شاعر) دونوں کا لہجہ محض خلاء میں جنم نہیں لیتا یا محض روایت اور کلاسکیت کا شکار نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ ایک حکمت ہے۔ منطق ہے۔ خیال کی رعنائی ہے فکر کی پاکیزگی اور پختگی بھی اور ساتھ ہی تہذیبِ شاعری کی پاسداری بھی کہ دونوں ہی اس خیال سے واقف تھے کہ تہذیب ادب اور تہذیبِ حیات دونوں کو الگ الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال غالب کو پسند کرتے ہیں اور فیض غالب اور اقبال دونوں کو۔ فیض جو کم سخن تھے اور کم نویس بھی اور مضمون نویسی کے ضمن میں بخیل بھی لیکن غالب اور اقبال پر دو دو تنقیدی مضامین لکھتے ہیں اور پیام مشرق کا ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ اپنی ہر تحریر و تقریر میں دونوں کی عظمتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اعترافِ اقبال میں ایک دلچسپ پہلو بھی نکلتا ہے۔ اقبال پر لکھے گئے دونوں مضامین میں فیض اقبال کے نظریات سے زیادہ جذبات پر زور دیتے ہیں۔ مضمون ''اقبال اپنی نظر میں'' کی ابتدا میں لکھتے ہیں ۔

> ''میری رائے میں کلامِ اقبال کا سب سے پُر خلوص سب سے دل گداز سب سے رسیلا جزو وہی ہے جو ان کی اپنی ذات سے متعلق ہے۔ یہ حصہ فلسفہ سے عاری

لیکن جذبہ سے بھرپور ہے۔اس میں خطابت کا جوش ناپید
ہے لیکن احساس کی شدت فراواں ہے۔اس کلام پر اقبال
کی حکیمانہ بزرگی کا انحصار بہت کم ہے۔اقبال کی شاعرانہ
عظمت کا انحصار بہت زیادہ ''۔

ان جملوں سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے تاہم یہ فیض کی اپنی رائے ہے۔اس رائے سے تفہیم اقبال کی تکمیل ہو یا نہ ہو تفہیم فیض ضرور ہوتی ہے کہ وہ اشترا کی وانقلابی شاعر ہونے کے باوجود شاعری میں فلسفہ،نعرہ سے زیادہ جذبہ پر زور دیتے ہیں۔فیض کا خیال ہے کہ فلسفہ ہو یا نعرہ ان سب کو جذبہ میں تحلیل ہو کر تخلیقی تجربہ کی شان اور شعری وجدان کا ناگزیر اور دلپذیر حصہ بن کر پیانۂ شعر میں ڈھلنا چاہئے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں نکالنا چاہئے کہ فیض جذبہ کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔وہ حکمت،حقیقت، خارجیت کے بھی خوب قائل ہیں۔اقبال کے یہاں پائے جانے والے ان عناصر پر گفتگو کرتے ہیں اور ایک مضمون میں ان کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں ۔

'' آفاقی طریقہ سے سوچنے کا ڈھب اور اس کے
سوچنے کی ترغیب ہمارے ہاں اقبال نے پیدا کی اور
آخری چیز جو میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے جو تخلیق کی وہ
شعروادب کے لئے ایک نئے مقام کا تعین تھا۔یہ مقام
اس سے پہلے ہمارے ہاں نہ شعر کو حاصل تھا نہ ادب کو،
شعر میں فکر،شعر میں حکمت اور شعر میں وہ عظمتیں جن کو
ہم شاعروں سے نہیں فلاسفروں سے متعلق کرتے ہیں وہ
محض اقبال کی وجہ سے ہمارے یہاں پیدا ہوئی۔''

ملاحظہ کیجئے.......ایک با مقصد، باعمل،سنجیدہ اور بڑے شاعر کا خراج.......
اس سے اقبال بڑے ہوتے ہیں اور فیض بھی۔اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداً فیض جو ہزار فلسفہ کے مقابلے جذبے کو اہمیت دیتے ہیں وہ بھی حکمت،مقصدیت، خارجیت

کے اثر سے بچ نہ پائے اوران کی شاعری ایک بامقصد اور باعمل شاعری بن کرابھری۔ ان سب اثرات میں آپ کو اقبال کا بھی اثر دکھائی دے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اقبال سے فکری طور پر متاثر ہونے والے فیض فطری اعتبار سے ایک الگ طبیعت و مذاق لے کر آئے تھے۔ انھوں نے تمام اثرات ونظریات کے باوجود سرشاری اور شاعری، شعریت اور غنائیت سے تا دمِ آخر پیچھا نہ چھڑایا۔ اگر یہ ایک طرف ان کی طبعی مجبوری تھی تو دوسری طرف سوچی سمجھی کوشش بھی کہ اقبال اور جوش کی پُر زور اور پُر شور، بلند آہنگ و بلند بانگ شاعری کہ جس کا اُس زمانہ میں طوطی بول رہا تھا۔ اس کی گھن گرج، پسندیدگی اور پذیرائی میں فیض کو اپنی ایک الگ راہ نکالنی تھی۔ الگ شناخت قائم کرنی تھی کہ سایۂ برگد سے نکل کر ہی آب و باد، روشنی اور زندگی مل سکتی تھی پھر یہ بھی تھا کہ آگے بڑھ کر اقبال اور فیض کے نظریات میں بھی نازک اور باریک فرق پیدا ہونے لگا۔

اقبال کا تصورِ تسخیرِ کائنات تمام انسانی فکر و عمل کے باوجود رضائے الٰہی سے وابستہ ہے۔ فیض اسے صرف انسانی رشتوں، پیداواری قوتوں اور جدلیاتی صورتوں کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ اقبال کا مردِ مومن ہے اور اس میں آفاق گم ہے اور فیض کا انسان آفاق میں گُم ہے مظلوم ہے۔ اقبال ستاروں سے آگے کا جہاں روشن کرتے ہیں اور فیض زمین کی تاریکی دور کرنا چاہتے ہیں جہاں عام انسان رہتے ہیں۔ گلی کوچے یہاں تک کہ کُتّے بھی ان کا موضوع بنتے ہیں۔ اس فرق کو یوں بھی دیکھیے۔ اقبال کی نظم طارق کی دعا کا پہلا شعر ہے........

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

فیض کی نظم کا پہلا شعر یوں ہے........

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتّے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی

ملاحظہ کیجیے....ایک موضوع، ایک آہنگ، لہجہ بھی ایک لیکن نظریہ مختلف۔

یہیں سے فیض اقبال سے الگ ہوتے ہیں اور یہ علیحدگی ضروری بھی تھی ورنہ تقلیدِ اقبال کہیں کا نہ رکھتی جیسے بعض مقلدین کو کہیں کا نہ رکھا۔ تقلید بہر حال تقلید ہے۔ فیض نے اساتذہ سے اثر لیا۔ میر، سودا، غالب سبھی سے اثر لیا۔ اقبال سے کچھ زیادہ ہی لیکن فیض اپنی خلاّقی، دراکی، نظریاتی پختگی کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ ابتدا سے ہی کلاسیکی شعریات اور مشرقی جمالیات میں ڈوبا ہوا ذہن ایک مخصوص و منفرد وژن عطا کر گیا۔ اسی لئے وہ روایت کا حصّہ بھی رہے اور سب سے علیحدہ بھی ہوئے۔ روایت اور کلاسکیت میں غرق ہونے کے باوجود الگ تھلگ۔ ان کی لفظیات بھی کلاسیکی تھی اس کے باوجود فکری اور معنوی اعتبار سے وہ منفرد ثابت ہوئے اور یہ بات بھی مصدق ہوئی کہ محض حرف ولفظ سے اسلوب وآہنگ نہیں بنتا۔ شاعر کا اصل اسلوب تو حرف ولفظ کی وساطت سے فکری اور وجدانی ہوتا ہے جہاں حرف ولفظ تخئیل شعر اور تخیلِ شاعر کے تابع ہوتے ہیں اور ایک معنیاتی نظام اور تخلیق وجدان میں ڈھل جاتے ہیں اور اپنی ایک نئی پہچان بناتے ہیں۔ جیسا کہ فیض کے ساتھ ہوا اگر اسلوب کا دارومدار محض حرف و لفظ پر ہوتا تو فیض مقلّدِ اقبال کے علاوہ کچھ اور نہ ہوتے۔ آج اگر فیض اقبال کے بعد بیسویں صدی کے دوسرے بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں تو اس میں ان کے اپنے فکر و خیال، جذبہ و شعور کا دخل ہے۔ اپنی ریاضت اور عبادت کا بھی۔ جہاں سے وہ اپنے قدماء سے علیحدہ ہوتے ہیں، ہم عصروں میں بھی اپنی الگ پہچان بناتے ہیں۔ یہ علیحدگی، یہ انفرادیت فیض کی اپنی ہے جہاں انفرادیت میں اجتماعیت بول رہی ہے اور اجتماعیت میں انفرادیت اور یہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب آپ قدیم و جدید پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ خواص و عوام پر یکساں نظر ہوتی ہے غرضکہ انسان اور انسانی زندگی سے غیر معمولی وابستگی اور نظریاتی پختگی سے۔ شاعری کی غیر معمولی ریاضت سے ایک جگہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں.......

> ''میں نے اقبال سے سیکھا ہے کہ فن ریاضت
> چاہتا ہے۔ ریاضت کے بغیر شعر میں نغمگی، موسیقی اور

تاثیر پیدا نہیں ہوتی۔ اقبال کی زندگی کے مطالعے سے
ہی میں نے جانا کہ شاعری ہمہ وقتی انہماک توجہ اور
ریاضت چاہتی ہے۔''

خیال رہے کہ فیض نے اقبال کی زندگی سے جس قدر سیکھا ہے شاید شاعری سے نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ اقبال کی زندگی اور شاعری کو الگ الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ہے پھر بھی فیض نے شعوری طور پر الگ راہ اپنائی اور ایسا ہر ذی شعور و ذی فہم شاعر کرتا ہے۔ ایک توازن قائم کرتا ہے اور توازن میں فرق اور علیٰحدگی کے راستے بھی دریافت کرتا ہے کچھ اس انداز سے کہ روایت کی زنجیر ٹوٹنے نہ پائے۔ تاریخ کی تصویر مسخ نہ ہونے پائے تصوّر قدیم و جدید دولخت نہ ہونے پائے۔ فیض اس عمل میں بھی کامیاب ہوئے یہی وجہ ہے کہ فیض کو غالب اور اقبال سے الگ کر کے دیکھ پانا ممکن نہیں۔ تبھی تو آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے اور سرور کے انھیں جملوں پر میں اپنے مقالہ کو ختم کرتا ہوں.......

''اقبال کو سمجھنا ہے تو غالب اور حالی کے پس منظر
میں، فیض کو سمجھنا ہے تو غالب اور اقبال کے پس منظر
میں دیکھنا ہوگا اس لئے کہ فیض اقبال کی پیامی لے کو ایک
نیا موڑ دیتے ہیں۔ بیسویں صدی کی اردو شاعری کا ارتقا
اقبال، جوش اور فیض کی مدد سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔''

فیض کی غالب شناسی

یوں تو عام طور پر لوگ واقف ہیں کہ ہم وطن، ہم زمین اور کسی حد تک ہم عصر ہونے کی وجہ سے فیض اقبال سے قربت اور عقیدت رکھتے تھے (حالانکہ اقبال، فیض سے تقریباً ۳۴ رسال بڑے تھے) زندگی میں کئی بار ملے بھی۔ شاباشی حاصل کی اور اقبال کے ہی سفارشی خط کے ذریعہ لاہور کے کالج میں ان کو داخلہ ملا۔ اسی کالج کے ایک جلسہ میں پہلے اقبال کی زندگی میں اقبال پر نظم کہی (۱۹۳۱) اس کے بعد اقبال کے انتقال پر بھی موثر نظم کہی (۱۹۳۸) جو اقبال کے تئیں گہرا اور سچا خراج تھی .....لیکن یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہئے ایک خاص موڑ تک وہ اقبال سے عقیدت رکھتے ہیں۔ آگے چل کر یہ راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ فیض فکری و شعری حوالوں سے وہ اقبال سے زیادہ غالب کے قریب نظر آتے ہیں حالانکہ وہ غالب سے کبھی ملے نہیں۔ ان کو دیکھا نہیں (دیکھ بھی نہیں سکتے کہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہو چکا تھا)......صرف دیوانِ غالب اور کلام غالب کے مخصوص و منفرد شاعرانہ تخیل و تفکر۔ اسلوب و آہنگ انھیں غالب کے قریب لے آیا۔

فیض نے ایک نہیں متعدد مضامین ،تقریر وتحریر میں غالب سے اپنی گہری عقیدت اور واقفیت کا اظہار کیا ہے۔عقیدت کا اظہار تو وہ اقبال کے لئے بھی کرتے ہیں۔مضامین بھی لکھے ہیں لیکن غالب سے عقیدت قدرے مختلف تھی۔اقبال کے تئیں ان کی عقیدت روحانی ہے لیکن غالب سے انسانی اور وجدانی ہے۔اسی لئے وہ اقبال سے زیادہ غالب کو پڑھتے ہیں۔عبادت بریلوی نے فیض سے ایک انٹرویو لیتے ہوئے سوال کیا تھا............''اردو شاعروں میں آپ نے کون کون سے شاعروں کا مطالعہ کیا ہے اور کون کون سے آپ کو پسند ہیں؟''......تو فیض کا جواب تھا..........''اصل میں مطالعہ جسے کہتے ہیں وہ تو میں نے ایک ہی شاعر کا کیا ہے یعنی غالب کا''.......اس کے بعد میر،سودا،نظیر انیس کا نام لیتے ہیں اور ہم عصروں میں راشد کا۔سچ یہ ہے کہ فیض کے ذہن کی شعاعیں پھوٹنے لگتی ہیں اور شاعری کو ہلکے پھلکے رومان اور عشقیہ جذبات سے نکال کر حیات وکائنات کے فلسفوں سے جوڑنے لگتے ہیں تو اس سنجیدہ فکری عمل میں جو شاعر سب سے زیادہ ان کے قریب آتا ہے ان کی رہنمائی کرتا ہے وہ غالب اور صرف غالب ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پہلے ہی مجموعہ کا نام غالب کے مصرعہ سے مستعار لیتے ہیں اور نقشِ فریادی نام رکھتے ہیں۔

کم سخن اور کم نویس فیض آگے چل کر غالب پر ایک نہیں تین تین مضامین، تبصرے اور ڈرامے لکھتے ہیں جس میں ایک مضمون غالب کی ایک مکمل غزل کا عملی تجزیہ ہے۔غالباً فیض کا پہلا اور آخری تجزیہ ہے جو انھوں نے کسی شاعر کی مکمل غزل کو لے کر اس کے ایک ایک شعر، ایک ایک مصرعہ کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔یہ تجزیہ پہلے تقریر کی شکل میں پاکستان نیشنل سینٹر اسلام آباد اور ادارۂ یادگار غالب کے مشترکہ اہتمام میں جولائی ۷۳ئ میں ایک جلسہ میں پیش کیا گیا اس کے بعد ہندوستان آجکل فروری ۷۴ئ میں بھی شائع ہوا۔اس سے قبل وہ ایک بیحد اہم مضمون ''غالب کے تخیل کے بنیادی عناصر'' لکھ چکے تھے جو ۱۹۴۴ء میں نیا ادب کے تیسرے شمارے میں شائع ہوا۔فیض نے غالب کی شاعری اور اس کے فلسفے کو بنیاد بنا کر ایک ڈراما بھی لکھا جوان

کے تنقیدی مضامین کی کتاب میزان میں شامل ہے۔اس کے علاوہ بکھری ہوئی نجانے کتنی تقریریں ہیں جن میں فیض نے غالب کو بنیاد بنا کر یا کسی دیگر حوالوں سے غالب کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔فیض کے دوست مرزا ظفر الحسن جو غالب کے بیحد عقیدت مند تھے انھوں نے پاکستان میں غالب لائبریری قائم کی۔اُس کے سالانہ جلسوں میں فیض اکثر جاتے۔تقریر کرتے۔ان تقریروں ،انٹرویوز اور دیگر تحریروں کو بہت بعد میں فیض کی اجازت سے مرزا ظفر الحسن نے لوح وقلم کے عنوان سے شائع بھی کر دیا۔اس میں وہ مکمل مضمون شامل نہیں ہے جو نیا ادب میں شائع ہوا اور وہ غالب سے متعلق فیض کا بیحد اہم مضمون ہے۔اسی کتاب میں فیض سے مختار زمن کا لیا ہوا ایک انٹرویو بھی شامل ہے جس کا عنوان ہی غالب ہے۔اس انٹرویو میں زمن نے براہ راست غالب کے موضوع پر فیض سے گفتگو کی ہے۔یہ گفتگو اصلاً انگریزی میں ہے لیکن زمن نے ہی اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔اسی کتاب میں نقش فریادی کے حوالے سے بھی غالب پر گفتگو کی گئی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔غرض کہ فیض کی شاعری ،فکر وخیال ، تنقید وتخلیق ہر جگہ غالب نظر آتے ہیں۔مجھے انھیں تحریروں وتقریروں کی روشنی میں فیض کی غالب شناسی پر مختصراً اظہار خیال کرنا ہے جو آسان کام نہیں ، بہر حال اپنی بساط بھر فیض کی غالب شناسی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

میں اپنی گفتگو کی ابتدا فیض کے اس مکمل مضمون سے کرتا ہوں جو نیا ادب میں شائع ہوا۔غالباً غالب پر یہ ان کی پہلی تحریر ہے جس کا عنوان ہے ''غالب کے تخیل کے بنیادی عناصر'' جس کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے.......

> ''غالب کے کلام میں زبان اور مضامین کے مختلف مدارج کے باوجود ہم ایک واضح اور نمایاں وحدت یعنی unity محسوس کرتے ہیں۔اس وحدت کی علت اور نوعیت کیا ہے۔وہ کون سا شیرازہ ہے جو غالب کے خیالات پریشان کو جزو بندی کرتا ہے۔

عام طور سے وحدت دو تین چیزوں سے پیدا ہوتی ہے
یا کسی مربوط نظریئے یا عقیدے کی وجہ سے جیسا کہ
اقبال کے کلام میں ہے۔"

محض ۲۳ سال کی عمر میں لکھا جانے والا یہ مضمون ابتدا ہی سے فکر غالب کے ساتھ ساتھ فکرِ فیض کا ایک وسیع در وا کرتا ہے۔ فیض تلاشِ وحدت میں یہ بھی کہتے ہیں کہ غالب فلسفی ہے نہ مُفکر اور ماورائیت بھی اس کی شاعری کا ایک عنصر ہے اور یہ بھی مشکل ہے کہ غالب کے یہاں ہر دور میں ہر رنگ اور مزاج کے اشعار ملتے ہیں۔ اسی لئے وحدت کی تلاش مشکل تو ہے۔ پھر وہ جذبہ کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کا یہ خیال سامنے آتا ہے کہ جذبہ کو بھی کسی ایک خیال یا معنی سے باندھا نہیں جا سکتا۔ اس کے الگ الگ وقت میں الگ الگ انداز کے معنی رہے ہیں۔ ان کا یہ جملہ جرأت مندانہ ہے ......"ہمارے ہاں جذبہ ایک بہت ہی مبہم اور غیر معین اصطلاح ہے جس سے کئی مختلف اور الگ تھلگ تجربات مُراد لئے جا سکتے ہیں۔"اس کے بعد وہ جذبہ کو Emotion, Feeling اور Mood میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان معنوی ابعاد اور تقسیمِ الفاظ کے باوجود وہ اعتماد سے کہتے ہیں......"غالب کے کلام کی وحدت یا Unity ایک ہی موڈ کی وجہ سے ہے۔ اگر Mood کا ترجمہ ہم کیفیت کر سکیں تو یوں کہنا چاہئے کہ غالب کے تمام مضامین اور تمام تجربات مختلف اور متنوع ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ہم رنگ کیفیت کے حامل ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ غالب کے کلام کی بنیادی کیفیت کیا ہے؟ اگر اس کے لئے میں کوئی ایک لفظ سوچ سکا ہوں تو وہ اُداسی ہے اور غالب کے تخئیل کا شیرازہ یہی اُداسی کی کیفیت ہے....."جیسا کہ عرض کیا گیا کہ فیض کا یہ مضمون ۱۹۴۴ء میں ترقی پسند تحریک کے رسالہ نیا ادب میں شائع ہوا تھا اس وقت تک فیض ترقی پسند مصنفین کی تنظیم و تحریک سے مکمل اور بھرپور طریقہ سے وابستہ ہو چکے تھے۔"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" یا "تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے" جیسے مصرعے خلق کر چکے تھے جو بطور محاورے اور بعد میں نعرے کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اور ہر ترقی پسند

شاعر امید و نشاط۔ اشتراک و احتجاج کی باتیں کر رہا تھا ایسے ماحول میں فیض غالب کی شاعری پر مضمون لکھتے ہوئے اس کی معروضیت اور رجائی کیفیت کے بجائے اُداسی پر بحث کرتے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے لیکن اسی مقام پر فیض کی انفرادیت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ جدت کے ساتھ ساتھ روایت کی پاسداری پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اردو شاعری میں اُداسی، رنجیدگی اور غم زدگی کے عناصر بڑے انمول رہے ہیں ان کو مختلف زاویہ سے پیش کر کے شعرائے متقدمین نے عالم بیزاری۔ اقتدار کی نفی اور زندگی کی بے ثباتی کو بڑے معنی خیز اور فکر انگیز طریقے سے پیش کیا ہے۔ خود غالب کے یہاں رنج و غم کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ بیحد پُر اثر اور کیفیت انگیز ہیں فیض نے اُداسی کا ذکر تو کیا لیکن فوراً ہی وہ کہہ اُٹھتے ہیں..........

''اُداسی سے میرا کیا مطلب ہے یہ میں ابھی عرض
کروں گا لیکن یہ میں ابھی کہہ دوں کہ میرا کیا مطلب
نہیں ہے .....اس سے میرا مطلب قنوطیت یا یاسیت
ہرگز نہیں۔۔۔''

پھر یہ بلیغ بات بھی کہتے ہیں ....

''اول تو قنوطیت واردات نہیں عقیدہ ہے
میں وہی قطعیت وہی تیقن اور وہی خود اعتمادی پائی جاتی
ہے جو رجائیت یا کسی دوسرے عقیدے میں دیکھتے
ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ قنوطیت یا یاسیت ایک منفرد
اور یک طرفہ چیز ہے لیکن اُداسی کوئی عقیدہ نہیں محض
ایک کیفیت ہے اور کیفیت بھی واضح اور متعین نہیں بلکہ
بہت دھندلی اور موہوم۔''

آگے چل کر وہ اس کیفیت کو بھی تین عناصر میں تقسیم کرتے ہیں۔ ماضی کی یاد، کچھ حال کی بے کیفی، کچھ مستقبل میں ماضی کے ٹوٹنے کی حسرت۔ امید بھی ناامیدی

بھی ....ان عناصر کی روشنی میں وہ غالب کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان اشعار سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں جن میں محبت، راحت اور لذّت ہے لیکن فیض ان اشعار میں ایک زاویہ یہ نکالتے ہیں کہتے ہیں.........''غور سے دیکھیں تو اس قسم کے بھرپور جوان اشعار میں غالب نے ہمیشہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ یہ اشعار ہمیشہ بیتے ہوئے جذبات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔''

فیض نے غالب کے بعض رجائی وحیات افزاء اشعار کو ماضی سے وابستہ کر کے ماضی اور معنی کا ایک نیا زاویہ تلاش کیا ہے کہ جب انسان کا حال اندوھناک اور اذیتاک ہوتا ہے تو وہ فطری اور فکری دونوں اعتبار سے ماضی کی طرف مراجعت کرتا ہے اور اسے ایک طاقت اور تقویت کے طور پر قبول کرتا ہے اسی لئے فیض نے کہا ہے کہ''ماضی ہی ایک چیز ہے جو غالب کے ذہن میں موہوم نہیں......'' دراصل ماضی کی اس مضبوطی میں حال کی کمزوری دکھائی دے رہی ہے۔ اسی لئے آگے بڑھ کر فیض نے غالب کے ان اشعار کا سہارا لیا ہے جو حال کی تباہی و بربادی سے تعلق رکھتے ہیں پس پردہ جن کا تعلق ۱۸۵۷ء کے حادثات سے تھا جس سے غالب بیحد متاثر تھے۔ متحیّر بھی اور متغیّر بھی۔ ان کیفیات سے متعلق فیض اشعار پیش کرتے ہیں۔ دو تین اشعار دیکھئے.........

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز ماہ و سال کہاں

اس میں جو یاد کا استعارہ ہے وہ ماضی کا اشاریہ ہے لیکن جو درد ہے وہ حال کا رزمیہ ہے۔ اس رزمیہ کو غالب نے کئی پہلوؤں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ویرانی میں دشت کو دیکھ کر گھر یاد آنا۔ در و دیوار پر سبزہ اور گھر میں بہار کی آمد اور پھر یہ ....''گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے'' لیکن یہ بھی کہتے ہیں.....انگلیاں فگار اپنی

خامہ خوں چکاں اپنا.'' ان غموں کو لے کر فیض کا ایک اور عمدہ اور معنی خیز جملہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ...... ''غالب غم آشنا ہیں غم پرست نہیں ....'' وہ ان غموں سے یا زخموں سے کہیں عرفان اور گیان دھیان۔ کہیں بے نیازی اور کہیں فلسفہ طرازی سے کام لیتا ہے جس سے شاعری میں رنگارنگی اور سنجیدگی تو پیدا ہوتی ہے لیکن مرکز میں باطن میں وہی اُداسی کی کیفیت ہے جسے فیض نے ابتدا میں وحدت کے طور پر لیا ہے۔ تین چار مصرعوں میں یہ رنگارنگی ملاحظہ کیجئے...... بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے/نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے/رات دن گردش میں ہیں سات آسماں۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔/آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب۔ کوئی دن اور بھی جئے ہوتے۔

لیکن اس تخریب میں غالب حسرت تعمیر بھی رکھتے ہیں........

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

× × ×

اس تخریب و تعمیر کے درمیان فیض غالب کی شاعری میں ماورائیت کی بھی ایک جہت دیکھتے ہیں۔ اچھی خاصی جمی جمائی بساط اُلٹ جائے۔ تہذیبیں اُجڑ جائیں۔ انسان کا خون پانی ہو جائے تو ماروائیت کی کفیت کا آ جانا غیر فطری نہیں لیکن غالب اس ماورائیت میں مجہولیت نہیں پیدا ہونے دیتے بلکہ اسے بھی تفکر کی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالب صوفی مزاج کے بھی تھے اس لئے اکثر مقام پر تصوف اور تفکر باہم مدغم ہو گئے ہیں۔ فیض نے اس مزاج کے اشعار بھی پیش کئے ہیں اور اس مصرعہ پر اپنی گفتگو ختم کرتے ہیں۔ ''عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے'' لیکن جلد ہی غالب کے اندر کا خوددار، اور طرحدار شاعران سب واقعات و حادثات کو ایک کھیل سمجھنے لگتا ہے اور ایسے بے پناہ غیر معمولی اشعار بھی خلق ہونے لگتے ہیں........

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
ایک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

فیض نے بڑی خوبی اور ہنرمندی کے ساتھ غالب کے ماضی اور حال کے کشاکش کو بظاہر اُداسی کے حوالے سے لیکن بباطن غالب کے اصل مزاج و کیفیت کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ فیض کا خیال ہے کہ ماضی اور حال کو الگ الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ہے۔ حال کے انتشار میں وہ لامحدود مناظر پیش کرتے چلے جاتے ہیں لکھتے ہیں..........

''اس کے نقوش ایک لامحدود پس منظر سے یوں
کھلتے چلے جاتے ہیں کہ تصویر اور اس کے پس منظر کو ایک
دوسرے سے جُدا کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔''

اس وحدت کے انیک روپ ہیں جو غالب کبھی محبوب کے بدن میں تلاش کرتے ہیں تو کبھی نقشِ فریادی کے کاغذی پیراہن میں۔ کبھی تخریب کی تصویر میں تو کبھی حسرتِ تعمیر میں۔ اس رنگا رنگی کو اکثر کم نظر اور قلیل فہم نقاد غالب کی موہومیت سے تعبیر کرنے لگتے ہیں لیکن فیض کہتے ہیں ؎

''اسی موہومیت کی وجہ سے غالب میں ایک ایسی
گہرائی، ایک ایسی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی ہے جو
اُنھیں معاملہ بند شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔''

فیض نے نہایت عرق ریزی اور عمیق نظری کے ساتھ اشعار کے حوالے سے غالب کے غم اور اُداسی میں ترقی پسندی اور روشن خیالی کے عناصر تلاش کئے ہیں وہ قابلِ داد تو ہے ہی نیز فیض کے ناقدانہ و دانشورانہ ذہن کی غمازی کرتے ہیں اور فیض کی شعری تخلیق و تفہیم کی نزاکتوں اور گہرائیوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ مضمون ختم ہونے سے پہلے یہ تحریریں آتی ہیں جن سے فیض کی ترقی پسندی اور غالب فہمی دونوں ہی اجاگر ہوتی ہیں ؎

''غالب کے کلام کے غم و نشاط دونوں میر یا داغ

کی طرح ذاتی و نجی نہیں بلکہ اجتماعی اور ہمہ گیر ہیں۔
خلاصہ یہ ہے کہ غالب کا کلام ایک موہوم ہمہ گیر اُداسی کا
آئینہ ہے۔ اس اُداسی میں ماضی کا غم ہے۔ حال سے
بے اطمنانی ہے انقلاب کی آرزو ہے۔ کچھ کرنے کی
حسرت ہے اور نہ کر سکنے کا دُکھ ہے۔''

اور مضمون ان جملوں پر ختم ہوتا ہے۔

''یہ کیفیت ایک فرد کی ذاتی کیفیت نہیں، ایک
نسل، ایک دور کی اجتماعی کیفیت تھی۔ غالب کی نسل
تاریخ کے ایک بڑے دوراہے پر کھڑی تھی۔ پرانا نظام
ٹوٹ چکا تھا اور نئے کی ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ غالب
کے ہم عصروں کو اس تعمیر کی حسرت تھی۔ پرانے شیرازۂ
حیات کو دوبارہ مرتب کرنے کی آرزو تھی۔ امید نہیں تھی۔
ماضی کے حسن کا احساس تھا لیکن حال کے خدوخال کے
ادراک یا رنگینی کے تصور کا دماغ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ
انھیں ماضی کے کھنڈروں میں بھی ایک حسن دکھائی دیتا
تھا۔ کسی خوبصورت عورت کے ڈھلتے ہوئے شباب کا سا
حسن یہی اُداس تاثر یہی اداس کیفیت ایک بوجھ' ایک
تھکن کی طرح ان کے سارے کاروبارِ دل و دماغ پر
حاوی تھے اور بدقسمتی سے ہمارا ماحول اور ہماری اجتماعی
واردات اس سے بہت مختلف نہیں ہے۔ غالب ایک
ایسے دور کا جذباتی ترجمان ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔
ایک ایسی نسل کا نغمہ سنج جو ابھی دفنائی نہیں گئی۔''

دیکھیے کس طرح غالب کی اُداسی، غالب کی شاعری کو فیض اپنے احساسات

اور اپنے دور کے حالات سے جوڑ کر اسے کہاں پہنچا دیتے ہیں اور یہ کام صرف فیض ہی کر سکتے ہیں جو صرف شعر نہیں کہتے بلکہ غنائی شاعری میں بھی تاریخ و تہذیب کے کیف و کم اور معاشرہ کے پیچ و خم کو جذب کر لیتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ فیض نے غالب کی ایک غزل کا عملی تجزیہ بھی کیا ہے جسے عملی تنقید کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ غالب کی مشہور و معروف غزل ہے۔

مُدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

غالب کی یہ غزل سترہ اشعار پر مشتمل ہے اور بقول فیض.........

''غالب کی سب سے طویل اور ان کی فکر و تکنیک کی سب سے نمائندہ غزل ہے۔ طوالت کے باوجود فیض کا خیال ہے کہ غزل میں شروع سے آخر تک ایک ہی بنیادی مضمون اور ایک ہی کیفیت ہے۔ یہ بالکل ایک راگ یا ایک میوزیکل کا مپوزیشن یا فلم کی طرح ہے۔''

فیض نے غزل کے مطلع کو پوری غزل کی تمہید قرار دیا ہے۔ اس پوری کیفیت کی تمہید جو اس غزل میں رچی بسی ہے اور یہ انفرادیت بھی کہ 'یار' کو خلوت میں لانے کے بجائے مہمان بنانے کا قصد لیا ہے۔ فیض مہمان لفظ کی تشریح کس انداز سے کرتے ہیں......

''اس شعر میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ مدت ہوئی ہے یار سے ملے ہوئے اور یار سے خلوت میں ملاقات کے لئے نہیں بلکہ یار کو مہماں کئے ہوئے مُدت گذر چکی ہے۔ مہمان کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کے دو پہلو غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کسی اجنبی کو یا کسی ایسے شخص کو مہمان نہیں رکھا جاتا جس سے کبھی کبھار کی ملاقات ہوئی ہو مہمان تو اسی کو رکھا جاتا ہے جس سے کافی میل ہو '

جس سے ایک پُرانا ربط ہو جس سے بے تکلفی کا رشتہ ہو۔
چنانچہ غالب محبوب سے تخلیہ میں ملاقات یا وصال کا ذکر
نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک ایسے شخص کا ذکر کر رہے ہیں
جس سے پُرانا تعلق خاطر ہے۔ بے تکلفی ہے، جس کا آنا
جانا ہے اور جس سے ملاقات نہیں بلکہ مہمانی مقصود ہے۔
مہمان داری کا اپنا ایک لطف ہے جو کہ ملاقات کے لطف پر
مستزاد ہے۔ دوسرا پہلو جس کی طرف میں آپ کی توجہ
مبذول کرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ یار یا محبوب کی مہمانداری
تخلیہ میں نہیں بلکہ جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ کوئی اکیلا ملنے کے لئے آیا ہے
بلکہ محفل ہے، بزم ہے اور غالب جس چیز کو یاد کر رہے ہیں
وہ وصالِ یار نہیں بلکہ محفلِ یاراں ہے۔''

محفل نوازی، محفل سازی اور محفلِ یاراں کے حوالے سے فیض نے کیا عمدہ اور باریک پہلو نکالا ہے اور اس پہلو کی بلاغت اس وقت اپنے عروج پر پہنچتی ہے جب اس میں فیض عصریت تلاش کرتے ہیں اور یہ معنی خیز جملہ نکالتے ہیں.......... ''انھیں محبوب کے بچھڑنے کا نہیں بلکہ محفل کے اجڑنے کا دُکھ ہے۔'' محفل صرف غالب کی نہیں بلکہ محفلِ دہلی اور بساطِ زندگی.......اسی لئے غالب اُداس ہیں۔

دیکھیے غالب کی اداسی یہاں بھی آ گئی۔ یہ اُداسی بقول فیض......'' غالب کی ذاتی کیفیت نہیں تھی بلکہ اس زمانے کے معاشرے کی اجتماعی کیفیت تھی...'' اس اجتماعی کیفیت میں ۱۸۵۷ء کے نشیب و فراز، بُحران و انتشار، اجتماعی تقلیب، تہذیبی تخریب کو دخل ہے جسے غالب کی چشمِ بینا نے دیکھا۔ اسی لئے پہلے شعر میں بزمِ چراغاں ہے تو دوسرے شعر میں..........

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو

مُدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

جگر لخت لخت کی اصطلاح ، دعوتِ مژگاں کی خواہش ، غالب کی غمگینی اور اُداسی کے وہ تخلیقی مظاہر ہیں جو فیض کو فکری و شعری سطح پر غیر معمولی طور پر متاثر کرتے ہیں اور آگے چل کر قدرے بدلی ہوئی شکل میں بلکہ یوں کہیے کہ لفظی ترکیب اور اصطلاحی تخلیق میں فیض کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔

اس مضمون میں فیض نے غالب کی اس اُداسی یا غمگینی کو سیکونس میں سمجھا اور پیش کیا ہے اور یہ بھی کہا............''غزل کے باقی شعر اسی مضمون پر ہیں کہ وہ شوق، وہ حسرت، وہ طلب اور وہ ہوس جو پرانی محفل کے لوازمات میں تھے انھیں اپنے آپ پر دوبارہ طاری کیا جائے۔''

اس طرح وہ تیزی سے دیگر اشعار کے معنوی ربط اور فکری وحدت کو بیان کرتے ہوئے غزل کے آخری چند اشعار پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں.......''بعد میں غالب کو خیال آتا ہے کہ یہ سب بیکار کی باتیں ہیں نہ تو محبوب آئے گا نہ گریبان چاک اور نہ شوق کا وہ عالم ہم پر طاری ہوگا کہ جس کے لئے ہم بھٹکتے پھرتے ہیں۔ آخر میں اُداسی کے بطن سے پیدا ہونے والی اس کیفیت کو بھی محسوس کرتے چلیے جہاں غالب مایوسی اور شکست خوردگی کے باوجود ہمت نہیں ہارتے اور حقائق کے متخالف تصورات پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں..........

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اور پھر مقطع میں غالب کا یہ تیور اُبھرتا ہے۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

اور مضمون اس شعر کی وضاحت کے ساتھ ان جملوں پر ختم ہوتا ہے۔

'' غالب یہ سب فضول باتیں ہیں کیوں یہ قصے

چھیڑتے ہو، کیوں محبوب کی یاد دلاتے ہو، کیوں محفل کا
ذکر کرتے ہو، جانے دو ان تمام باتوں کو اب اس کے سوا
کوئی چارہ نہیں کہ ہم تہیۂ طوفاں کرلیں۔ رونا دھونا کرلیں
دل کا بخار ہلکا کرلیں۔ اب کچھ ہونا ہوانا نہیں ہے۔ اس
لیے غالب بہتر یہی ہے کہ تم سارے ذکر اذکار سے پرہیز
کروتا کہ یہ طوفان تھم جائے، ختم ہو جائے۔''

فیض کا یہ تجزیاتی مضمون ان کے پہلے والے مضمون کے تصورات و خیالات سے بہت مختلف نہیں ہے البتہ انداز و اسلوب مختلف ضرور ہے اور اسے ہونا بھی چاہئے کہ پہلا مضمون فکری اور تنقیدی نوعیت کا ہے اور دوسرا عملی اور تجزیاتی۔ دوسرے مضمون کی یہ خصوصیت تو ہے ہی کہ اس تجزیاتی عمل میں غزل کے داخلی مزاج اور بالخصوص غالب کی غزل ترکیب و تنظیم کو لفظی اور اصطلاحی معنوں میں کس انداز سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ اندرون میں داخل ہو کر باطنی کیفیات کے ایک ایک موڈ میں اُتر کر وہ غالب کی ذہنی کیفیت کو بخوبی اور کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ فیض کا اپنا انداز ہے۔ غالب فہمی کا نیا انداز۔ جس کا ایک انوکھا اور نرالا رُخ غالب سے متعلق لکھے گئے ڈرامے میں ملتا ہے۔ راقم الحروف نے اس ڈرامے پر الگ سے مضمون قلمبند کیا ہے جو شائع بھی ہو چکا ہے۔ یہاں پر فلسفۂ غالب سے متعلق اس ڈرامے کے دو ایک اقتباس پیش کر کے گفتگو کو آگے بڑھاؤں گا۔ یہ اقتباس ڈرامے کے ایک کردار کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے:۔

''ماضی سے متعلق غالب کا تخیل موہوم نہیں ہے
لیکن جب بھی غالب اپنے حال کی کیفیات کا حال بیان
کرنا شروع کرتے ہیں۔ ہر کیفیت میں ایک بُعد' ایک
دوری سی' ایک دھندلاہٹ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ تصویر
سامنے آتی ہے لیکن اس کے نقوش ایک لامحدود پس منظر
سے یوں گھلتے ملتے چلے جاتے ہیں کہ تصویر اور اس کے پس

منظر کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔''
ایک اور کردار کے ذریعہ فیض ان تحریروں پر ڈرامے کو ختم کرتے ہیں :۔

''غالب کا دور کہہ لو، غالب کا زمانہ کہہ لو، غالب
جیسا کہ آپ کو معلوم ہے تاریخ کے ایک بڑے دوراہے
پر کھڑا تھا پرانا نظام ٹوٹ چکا تھا اور نئے کی ابھی تعمیر نہیں
ہوئی تھی' غالب کے ہم عصروں کو اس تعمیر کی حسرت
نہیں۔ اس کا یارا نہیں تھا، پرانے شیرازۂ حیات کو
دوبارہ مرتب کرنے کی آرزو نہیں .... غالب ایک
ایسے دور کا ترجمان ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ ایک ایسی
نسل کا نغمہ جو دفنائی نہیں گئی۔''

مضمون کے جملوں میں تکرار ملتی ہے بلکہ لگتا ہے کہ مضمون کو ہی ڈراما بنا دیا گیا ہے۔ اس شعر پر ڈراما ختم ہوتا ہے:۔

اے تازہ واردانِ بساط ہوائے دل
زنہار گر تمہیں ہوسِ ناؤ نوش ہے

اب میں مرزا ظفر الحسن کی مرتب کردہ کتاب لوح و قلم میں شامل غالب سے متعلق چند تحریروں و تقریروں کے چند اقتباسات پیش کروں گا جس سے فیض کی غالب شناسی کے کچھ اور پہلو سامنے آتے ہیں۔

ادارۂ یادگار غالب اور سرسید گرلز کالج کی ایک مشترکہ محفل میں فیض سے غالب پر تقریر کرنے کو کہا گیا۔ یوں تو فیض نثر نویسی اور اس سے زیادہ تقریر سے گھبراتے تھے لیکن غالب موضوع ہو تو وہ حامی بھر لیتے۔ اس تقریر میں بھی وہ پہلے غالب کی ماضی پرستی کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد غالب کے دیوان کے پہلے شعر کے حوالے سے کہتے ہیں........

''نقش یعنی ہر وہ چیز جو کاغذ پر تحریر کی جائے خواہ وہ
تصویر کی صورت میں ہو یا تحریر کی شکل میں ہو، اپنے لکھنے

والے یا مصوّر کی فریاد کرتی ہے اور اُس کا ثبوت یہ ہے کہ
اُس نے کاغذ کا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ معنی ہر جگہ بتائے
جاتے ہیں اور ہر جگہ لکھے ہوئے ملیں گے۔

جو لوگ ذرا باریک بین ہیں وہ اس شعر کو تصوف کی
طرف لے جاتے ہیں اور معنی یہ بتاتے ہیں کہ غالب
اپنے خالق کا گلہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان
پیدا کئے ہیں یا جو اُس کا نقش ہے اُس میں اس طرح کی
صفات رکھ دی گئی ہے یا اُسے اس قسم کی خوبیاں دی گئی
ہیں یا اُس کی فطرت ہی اس قسم کی بنائی گئی ہے کہ اُسے
طرح طرح کی مصیبتیں، مسائل اور مشکلات پیش آتی
ہیں اور اس وجہ سے وہ اپنے خالق کا فریادی ہے۔ میری
رائے میں اس شعر کے یہ معنی کسی طرح بھی نہیں بنتے
کیونکہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ معنی صحیح ہیں تو دوسرے
مصرعے میں کاغذی پیرہن کا جو استعارہ ہے وہ پھر مہمل
ہو جاتا ہے۔ کوئی انسان کاغذی پیرہن پہن کر نہیں
پھرتا۔ کاغذی پیرہن سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ شعر صرف
اس تحریر یا تخلیق کے بارے میں ہے جو کہ انسان کرتا ہے
نہ کہ اُس تخلیق کے بارے میں جو کہ اللہ کرتا ہے۔''

غالب کے غیر معمولی شہرت یافتہ اس شعر کی شرح دیگر شرحوں سے
کسقدر مختلف ہے۔ فیض کی رسائی شعر اور نزاکتِ احساس کا شعور غیر معمولی تھا۔
البتہ انداز ناقدانہ کم مُدرسانہ زیادہ ہو گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ یہ تقریر و تشریح
ایک کالج میں کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہاں طلباء بھی رہے ہوں گے۔ بہر حال
اس خیال سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن فیض کی باریک بینی اور غالب فہمی کی ایک

نئی صورت تو اُجاگر ہوتی ہی ہے۔ وہ اس شعر کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ ڈوب جاتے ہیں اور لفظ شوخی کی وضاحت یوں کرتے ہیں ....'' اس شعر میں شوخی سے مُراد شرارت یا کھلنڈرا پن نہیں ہے۔ شوخی کا مفہوم وہی ہے جسے انگریزی میں ان ٹین سٹی کہتے ہیں۔'' اور پھر اس غزل کے دوسرے اشعار اور بعض فارسی اشعار کے ذریعہ وہ غالب کے سوزِ نہاں کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سوز نہاں کے مختلف پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں۔ غالب نے اس سوز نہاں کو مختلف پیرایے میں پیش کیا ہے لیکن یہ بھی لگتا ہے کہ حرف و لفظ غالب کی سوزش کے متحمل نہیں ہیں۔ اس مقام پر فیض کا ایک گہرا فکری اور تخلیقی تجربہ ان خیالات کو پیش کرتا ہے ۔

> ''الفاظ ایک محدود چیز ہیں۔ آپ کے تجربات اور محسوسات یا آپ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ سب غیر محدود ہیں۔ وہ مرئی یا مادّی چیز نہیں ہیں۔ اگر آپ کسی پھول کو دیکھتے ہیں تو اس میں آپ کو رنگ ملتا ہے اس میں خوشبو ہوتی ہے۔ اس کے اردگرد پتّے ہوتے ہیں۔ خاص خاص اوقات میں دیکھیں تو دھوپ میں وہ کچھ اور نظر آتا ہے اور چھاؤں میں کسی اور طرح سے۔ ان ساری باتوں کو آپ دو چار سطروں میں لکھنا یا دو چار جملوں میں بیان کرنا چاہیں تو بہت مشکل ہے۔ کیونکہ وہ سب باتیں چند جملوں یا سطروں میں نہیں سما سکتیں۔ ان کو پانچ دس اشعار میں بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ الفاظ اور کاغذ دونوں محدود، مادّی اور مرئی چیزیں ہیں اور محسوسات، مشاہدات اور تجربات غیر مرئی چیزیں ہیں۔''

وہ لوگ جو ساسور کے لسانی فلسفہ اور لغت کے ذخیرے کے ذریعہ حرف و لفظ کو

ہی تخلیق اظہار کا اولین حوالہ مانتے ہیں انھیں فیض کے مندرجہ بالا خیالات کو غور سے پڑھنا چاہئے کہ یہ خیالات فیض کے ہیں اور فیض بیسویں صدی کے ایک بیحد اہم اور بڑے شاعر ہیں۔ دانشور ہیں اور ہر طبقہٗ فکر میں یکساں مقبولیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح کچھ اور شعری رموز اور اسرار پر باتیں کرنے کے بعد خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے۔

''اجتماعی عذاب کا جو عالم تھا غالب نے اسے اپنے کلام میں سمونے کی کوشش کی۔ اور یہ اتنی بڑی چیز تھی کہ اُس کے اظہار کے لئے الفاظ کافی نہیں تھے۔ بڑی شاعری کی یہی علامت اور بڑے شاعر کا ہی ثبوت ہوتا ہے کہ جو مضمون وہ بیان کرتا ہے اُس کی وسعت اس کے عہد کی وسعت کے مقابلے میں کتنی ہے اور اس کے اپنے درد کے علاوہ باقی دنیا اور باقی انسانیت کا کتنا درد اُس نے اپنے کلام میں شامل کیا ہے۔ جتنا زیادہ عظیم اُس کا درد ہوگا اتنا ہی عظیم اُس کا کلام ہوگا۔ اس کسوٹی پر غالب پورے اترتے ہیں۔ بلا شبہ غالب بہت بڑا شاعر تھا۔''

اب میں غالب سے متعلق مختار زمن کی انگریزی میں کی گئی گفتگو کے اردو ترجمہ کے دو ایک اقتباس پیش کروں گا۔ گفتگو کا پہلا ہی سوال تھا کہ غالب کی عظمت کا راز کیا ہے؟ فیض جواب دیتے ہیں.......

''تنوع اور تازگی عظیم شاعری کی خصوصیات ہیں۔ اگر چہ ہر بڑے شاعر کی عظمت کے اسباب یکساں نہیں ہوتے لیکن بعض خصوصات یکساں ہوتی ہیں۔ غالب کی عظمت کا راز بھی حقائق نامہ سے ہم آہنگی میں مضمر ہے۔''

ایک اور سوال کے جواب میں فیض کہتے ہیں:۔

'' اچھی شاعری کی وہ خصوصیت یعنی تشبیہہ و

استعارے سے مضمون آفرینی غالب کے یہاں بدرجۂ اتم
پائی جاتی ہے۔ ان سب کے علاوہ غالب نے شاعروں کی
ستم رانی سے شاعری کو نجات دلائی۔ اس لئے کہ اُس نے
وہ لفظی شعبدہ بازی ترک کر دیں جو مشاعروں کے اُن
سامعین پر جن کا ردِّ عمل معلوم ومصروف ہے اثر اندازی
کے لئے استعمال کی جاتی ہیں اس طور پر اس نے ''بلند
سنجیدگی'' کی شاعری کا راستہ ہموار کیا۔''

دیکھئے ستم رانی کا لفظ استعمال کر کے فیض نے روایتی لفظی شعبدہ بازی کے حوالے سے ایک نیا پہلو نکالا ہے اور بلند سنجیدگی کی اصطلاح پیش کی۔ اس گفتگو کا ایک جملہ اور پیش کر کے میں اپنی گفتگو کا رُخ قدرے تبدیل کرنا چاہوں گا اور مقالے کو ایک اور سمت لے جا کر ختم کروں گا۔ فیض اس گفتگو میں یہ اعتراف کرتے ہیں.........

''دیوانِ غالب کا ایک نُسخہ ہمیشہ میرے سرہانے رہتا
ہے۔ میں اکثر بلکہ بعض حالات میں روزانہ اس کا مطالعہ
کرتا ہوں ۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ غالب کا منتہی
ہو گیا۔ میں اپنی شاعری میں اُسے شعوری اور غیر شعوری طور
پر استعمال کرتا ہوں۔''

فیض کی غالب فہمی کے کیا ابعاد ہیں اور ان کی غالب شناسی کے کتنے پہلو تنقید کی سطح پر اُبھرے ہیں یہ ایک الگ موضوع جس پر میں نے مختصراً گفتگو کی لیکن شعرِ غالب، فکرِ غالب اور زبانِ غالب کے اشارے واستعارے خود فیض کی شاعری میں شعوری یا لاشعوری انداز سے جذب و پیوست ہوئے ہیں۔ کس نوع سے تحلیل ہوئے ہیں یہ ایک دوسرا موضوع ہے جو تفصیلی اور گہرے مطالعہ کا متقاضی ہے جو میرے ناقص ذہن اور کمزور قلم کے ذریعہ ممکن نہیں تاہم چند اشارے کر کے اپنی گفتگو کو تمام کروں گا۔

اس تجسیم وتحلیل کا پہلا تخلیقی اظہار تو فیض کے پہلے شعری مجموعہ کا عنوان ہے۔ نقشِ فریادی غالب نے جن معنوں میں نقش فریادی کاغذی پیراہن وغیرہ کا علامتی و استعاراتی استعمال کیا ہے۔

دیکھا جائے تو فیض کی پوری شاعری بدلی ہوئی شکل میں اسی محبت اور فریاد پر ٹکی ہوئی ہے جو آگے بڑھ کر احتجاج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کہیں کہیں للکار اور انقلاب کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اُداسی، بے چینی، اضطراب دونوں میں مشترک ہے۔

قفس اداس ہے یاروصبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکرِ یار چلے

اور غالب کا یہ شعر دیکھئے........

مدت ہوئی یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے

× × ×

باوجود اس کے کہ شخصیت کے معاملات میں غالب اور فیض میں خاصا بُعد اور فرق ہے۔ غالب کے یہاں شوخی ہے تو فیض کے یہاں خاموشی۔ غالب کے یہاں دھول دھپّا ابھی نظر آ جاتا ہے لیکن فیض محبوب کا سامنا کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ اس لئے کہ غالب شروع ہی سے کھلنڈرے رہے اور فیض سنجیدہ اور خاموش طبع۔ ان تمام باتوں کے اختلاف کے باوجود غالب کا زندگی کو دیکھنے اور برتنے کا نظریہ، شاعری کا انوکھا تجربہ، نئے نئے خیالات کو نئے نئے انداز میں کہنے کا حوصلہ فیض کو متاثر کرتا ہے اور غیر شعوری طور پر غالب کی طرف مُڑ جاتے بلکہ ڈوب جاتے ہیں۔ جب اُبھرتے ہیں تو حالاتِ حاضرہ کے کچھ ایسے رشتے استوار کرتے ہیں کہ کلاسکیت وقدامت کو جدید فکری نظام دستیاب ہو جاتا ہے۔ دونوں کے تخلیقی وتفکیری انجذاب وامتزاج نے کچھ ایسا رنگ، کچھ ایسا اسلوب اختیار کیا جو سب کا ہوتا ہوا بھی فیض کا اپنا تھا۔ فیض نے حقیقت سے پرے رومان میں بھی نیا انداز اختیار کیا۔ دونوں ہی سطح پر یاسیت وقنوطیت نام کو نہیں' اداسی

ضرور ہے۔ جو غالب کی اُنیسویں صدی کی اُداسی سے آگے بڑھ کر بیسویں صدی کی اُداسی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہی دونوں شاعروں کے امتیازات ہیں کہ صدی کوئی بھی ہو اُداسی ہر صدی میں ایک نئے رنگ روپ میں اثباتی رویوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ غالب نے المناک ماحول میں جمال کی تازگی کو باقی رکھا۔ فیض نے ہر مصیبت، ہر موڑ پر محبوب کو اپنے ساتھ رکھا اور یہاں تک کہہ دیا.........

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلدارئی عروسِ سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگر چہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخئ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حُسن کے نام

مثالیں اور بھی ہیں جو کوئے یار سے لے کر سوئے دار تک پھیلی ہوئی ہیں۔ فیض کے یہاں غالب کی زمین ملتی ہے تو غالب کا آسمان بھی۔ غالب کی فکر ملتی ہے تو غالب کا وجدان بھی۔ اور بہت سارے الفاظ اور تراکیب بھی۔ لوح وقلم، حلقۂ زنجیر، نجاتِ دیدہ ودل، حکایاتِ خوں چکاں، تہہ نجوم، پیرہن، مقتل، صبا اور نجانے کیا کیا۔ ایک ادیب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ڈھونڈا جائے تو فیض کے سارے مجموعوں کے نام بھی دیوانِ غالب میں مل جائیں گے۔ ہوسکتا ہے یہ سچ ہو۔ فیض کے حوالے سے ڈاکٹر آغا سہیل کے ان جملوں کو دیکھئے۔

"ہاں یہ صحیح ہے کہ دیوانِ غالب کے مطالعہ کے وقت فیض نے فکرِ غالب سے اکتساب کیا ہوگا چراغ سے چراغ جلائے ہوں گے۔ فیض کی خوبی یقیناً ہے کہ انھوں نے ایک ذہین آدمی کی طرح غالب سے فیض اٹھایا۔

غالب کے افکار و نظریات کو من وعن قبول نہیں کیا۔ قطع
بُرید و کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ سے بھی کام لیا یہ تو
غالب کی ہمہ گیری آفاقیت اور ہمہ جہت دل آویزی
ہے کہ وہ ہر نوع کے افراد کو متاثر کرتے ہیں لیکن
بیسویں صدی کے بیشتر دانشوروں بقدر آگہی غالب
سے عام طور پر فیض نے خاص طور پر فیض اُٹھایا اور
اپنے فن کو با اعتبار بنایا۔''

ایک جگہ اور عمدہ بات لکھتے ہیں۔

''فیض نے غالب سے کیا فیض اُٹھایا اور فکرِ فیض کا
سفر کس منزل تک پہنچا۔ لفظوں کی دروبست کا مطالعہ ضمنی
سہی لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ فیض کے شعوری ارتقا میں
لفظوں نے بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔ فیض کے فکری
نظام کی ترسیل میں ان لفظوں کے رنگوں اور عکسوں
(Shades) کا بھی عمل شامل ہے۔ لفظوں کا مزاج اور
آہنگ فیض خوب پہچانتے ہیں اور نہایت احتیاط سے
استعمال کرتے ہیں لیکن لفظوں کی خاطر شعر نہیں کہتے۔
شعر کی خاطر لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ
فیض کے تخیل سے لفظ دبے رہتے ہیں لفظوں سے تخیل
نہیں بنتا۔ یہ بات غالب نے پہچانی تھی مشکل سے مشکل
مفاہیم غالب کے یہاں تلاش کیجئے الفاظ اس کے تابع
ہوں گے۔ مفہوم لفظوں کے تابع نہ ہوگا۔''

(فیض اور غالب)

روسی ادیب و دانشور لُدمیلا واسی لیوا جنھوں نے غالب پر عمدہ کام کیا ہے اور

فیض پر بھی فیض کی کتاب میں فیض اور غالب کے حوالے سے ایک جگہ لکھتی ہیں.........

''ابھی تک سب سے پہلے فیض اور اقبال کے روحانی تعلق کی بات ہوتی آئی ہے پھر بھی فیض کی تخلیقات میں غالب ایک بہت ہی خاص مقام رکھتے ہیں۔فیض کی تخلیقات کلام غالب سے بنیادی طور پر پیوستہ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس سے بہت مختلف بھی ہیں۔ غالب کی طرح فیض بھی کسی طرح کے حقائق اور نظریات کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے تھے بلکہ استعاروں کے ذریعے زندگی کے مظاہر کی ترجمانی کرتے تھے۔اپنے نظریۂ حیات کی توضیح کرتے ہوئے فیض اکثر غالب کی طرف رجوع ہوتے تھے۔غالب سے مستعار لیے ہوئے استعاروں کو فیض کے کلام میں ایک نیا آہنگ ملتا ہے۔''

حوالے اور ہیں، اشارے بھی اور لیکن میں فیض کے چند اشعار پر اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں ۔ ان اشعار کو بغور ملاحظہ کیجئے ۔ حالات پاکستان کے ہیں، حکومت ایوب خاں کی ہے لیکن آہنگ غالب کا ہے اور یہی فیض کی انفرادیت ہے کہ سماجی اور سیاسی حالات کیسے دگرگوں کیوں نہ ہوں وہ شاعری کا فن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ غالب کا دامن نہیں چھوڑتے۔

اب بزمِ سخن صحبِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفہ بے طلباں ہے
گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے
پیوند رہِ جوچۂ زر چشمِ غزالاں
پابوسِ ہوس افسرِ شمشاد قداں ہے

یاں اہلِ جنوں یک بہ دگرِ دست و گریباں
واں جیشِ ہوس تیغ بکف در پئے جاں ہے
اب صاحب انصاف ہے خود طالب انصاف
مُہر اُس کی میزان بہ دستِ وگراں ہے
ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے
(ایک شہر آشوب کا آغاز)

فیض کی نظم ''تنہائی'' پر چند باتیں

پھر کوئی آیا دلِ زار ! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا ، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سُراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا

تنہائی فیض کی مشہور و معروف نظموں میں سے ایک ہے اور اکثر خیال کے

مطابق فیض کی دیگر نظموں کے مقابلے کئی اعتبار سے مختلف و منفرد بھی۔ حسن عسکری نے کہا تھا۔

''اردو میں لے دے کے چند نظمیں ہیں جن
میں ایک فیض صاحب کی تنہائی ہے۔''

ممتاز ترقی پسند ناقد ممتاز حسین نے اس نظم کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

''یہ نظم اپنی ہیئت میں نامیاتی وحدت کی
خصوصیت کی حامل ہے۔ نظم کیا ہے ایک ایکشن
پینٹنگ (Action Painting) ہے کہ اس کا ہر لفظ
رقصِ کناں ہے۔ نظم کے دائرے کو مکمل کرتا ہے۔''

اس کے علاوہ فراق گورکھپوری، کلیم الدین احمد، ن۔م۔راشد وغیرہ نے بھی اس نظم کی تعریف کی ہے لیکن جمیل جالبی اس نظم کے بارے میں اس قسم کی رائے رکھتے ہیں۔

''نہ تو یہ نظم سیاست میں اُلجھے ہوئے لمحے کی
پیداوار ہے اور نہ تہذیب و مذہب کے شیرازہ بکھر
جانے سے کوئی واسطہ رکھتی ہے اور ظاہری اطوار میں
اس نظم کے مصرعوں میں بھی کوئی ربط اور وابستگی نہیں
ہے محض یاس کے حوالے سے ایک مصرعے کو دوسرے
مصرعے سے منسلک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب فیض نے یہ نظم کہی تو سب سے پہلے محمد دین تاثیر کو سُنانے پہنچے۔ تاثیر نے نظم سُنی تو جھنجھلا کر کہا......... ''فیض تم نے یہ کیسی نظم کہدی۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی طوائف کسی گاہک کا انتظار کر رہی ہے اور جب کوئی گاہک نہیں آیا تو مایوس ہو کر چراغوں کو گل کرنے لگتی ہے۔ کواڑوں کو بند کرنے لگتی ہے اس یقین کے ساتھ کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔''

فیض اپنی عمدہ نظم کے بارے میں تاثیر کی یہ رائے سُن کر رنجیدہ ہو گئے لیکن اپنے مزاج کے مطابق کوئی بحث نہیں کی اور خاموشی سے واپس چلے آئے۔

بعض دیگر حضرات نے بھی اس نظم کو مہمل، یا سیت کا نچوڑ اور نجانے کیا کیا کہا ہے چونکہ اس نظم میں رومانیت کا غبار ہے، ابہام ہے اس لیے ہر اک نے اپنے اپنے اعتبار سے معنی و مطلب برآمد کئے ہیں۔ اکثر اس نظم کو محبوب کی غیر موجودگی، اس کا انتظار، نہ آنے کا کرب اور تنہائی کے احساس کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ ظاہری طور پر ایسا نظر بھی آتا ہے۔ کچھ لوگوں نے عنوان کے تحت اسے مکمل طور پر تنہائی یا احساسِ تنہائی کے حوالے سے دیکھا اور بہت کچھ کہہ ڈالا۔ ایک ادیب (ستار طاہر) نے تو یہاں تک سوچ لیا۔

> ''تنہائی آج کے انسان کا مقدر ہے اور انسان کی تنہائی ایک موضوع ہے، جس قسم کی خاص تنہائی کا ذائقہ انسان نے بیسویں صدی میں چکھا ہے یہ ذائقہ ہی کچھ اور ہے۔''

پھر انھوں نے ڈلن تھامسن، نطشے، بریخت وغیرہ کے حوالے سے تنہائی کے فلسفہ پر بحث کر ڈالی اور پھر یہ بھی کہا........''اس موضوع پر فیض صاحب کی نظم سب سے الگ تھلگ سربلند اور منفرد دکھائی دیتی ہے۔ اس نظم میں فیض نے اس تنہائی کو موضوع بنایا ہے جو بیسویں صدی کے انسان کو چاٹ رہی ہے۔''

یہ سچ ہے کہ نظم کا عنوان تنہائی ہے اور اس میں تنہائی کا ذکر بھی ہے لیکن پورے طور پر یہ نظم محض فلسفہ تنہائی سے ہی تعلق رکھتی ہو یہ بات سچ نہیں ہے لیکن اکثر جدید نقادوں کو فیض کی یہ نظم اور اس کا مبہم اسلوب اس قدر موافق آیا کہ وہ اسے اُس تنہائی سے ملاتے رہے جو جدیدیت کے حوالے سے جدید شاعروں نے آج کے انسان کا مقدر اور اس کے بعد اپنے کلام کا محور بنا رکھا تھا۔

فیض چونکہ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے۔ عشقیہ اور جمالیاتی پیرایۂ اظہار

ان کی تخصیص رہی ہے۔اس لیے ان کی شاعری کے بیشتر حصّوں کو انھیں حوالوں سے زیادہ دیکھا گیا۔اور یہ غلط بھی نہیں ہے لیکن وہ لوگ جو رومان؛ کے مشروط معنی اور عشق کا محدود تصور رکھتے ہیں اکثر فیض کی شاعری کو ایک خاص تناظر میں ہی دیکھ پاتے ہیں۔ کچھ فیض کا فن بھی اس نوع کا ہے کہ ظاہر و باطن۔ ذات اور کائنات باہم فنکارانہ انداز میں اس انداز سے مُدغم ہو گئے کہ انھیں الگ الگ کر کے دیکھ پانا ممکن نہیں ہو پاتا۔تاہم اس عمدہ، بلیغ اور موثر نظم پر نئے سرے سے نظر ڈالنے اور غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے خاص طور پر نو مصرعوں کی اس نظم میں آخر کے چار مصرعوں کو بہ نظرِ عمیق دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے ؎

اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سُراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کو اڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

محض عشقیہ جذبات کے حوالے سے یہ نتائج یا اختتامی مایوس کُن اثرات اردو شاعری میں شاید ہی نظر آتے ہوں اور فیض جیسا ترقی پسند شعور وفکر کا شاعر جو آخری سانس تک امید ونشاط، دل اور جذبات کی ترجمانی کرتا رہا ہو اس کے یہاں معاملاتِ عشق میں ایسی مایوسی کم کم بلکہ نہیں کے برابر ہے....اس لیے اس نظم کو محض معشوق کے انتظار یا مایوسی کے آثار اور محض معشوق کے حوالے سے مکمل بیزاری کے حوالے سے دیکھ پانا میری نظر میں مناسب نہیں۔ظاہر ہے کہ اس میں کچھ اور عمیق و بلیغ اشارے ہیں جن پر نظریں کم لوگوں کی پہنچتی ہیں اگر پہنچتی ہیں تو آدھی ادھوری۔

افہام وتفہیم کے ان مختلف ابعاد کی میں تردید نہیں کرتا لیکن میری ناقص رائے میں اس نظم کا غالب رجحان سیاسی ہے لیکن فیض کا فنکارانہ امتیاز یہی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے سیاسی موضوع کو بھی عشق و جمال کی سطح پر رومانی اور غنائی اسلوب میں پیش کرتے ہیں اور یہ ہنر انھوں نے اس نظم میں بھی دکھایا قدرے بدلے ہوئے

اسلوب اور بدلی ہوئی لفظیات میں فیض بار بار یہ کہتے رہے ہیں ؎

خیالِ یار کبھی ذکرِ یار کرتے ہیں
اسی متاع پر ہم روز گار کرتے ہیں
انھیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے ہیں

× × ×

امریکہ کے شہر نیویارک کے جشنِ فیض (2011) میں علی گڈھ کے پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے اسی نظم کا اسلوبیاتی تجزیہ پیش کیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ صدارت کر رہے تھے۔ تجزیہ خالص حرف ولفظ پر مشتمل تھا معنی ومطلب سے بالکل دور ـــــ مقالہ ختم ہوا تو بحث کے دوران میں نے سوال اُٹھایا کہ اسلوبیاتی مطالعہ اگر معنی سے بالکل الگ کر کے کیا جائے تو اکہرا ہوگا۔ اسلوبیاتی اور معنیاتی نظام متوازی طور پر ساتھ چلیں تو بہتر ہے اس کی بہترین مثال خود پروفیسر نارنگ کا مضمون ہے۔

(فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام) ـــــ پھر میں نے یہ بھی سوال کیا کہ اس نظم میں کس کا انتظار ہے اور کس کے نہ آنے پر فیصلہ کن مایوسی ہے۔

صدارتی خطبہ میں پروفیسر نارنگ نے کہا کہ اس نظم میں ہندوستان کی سیاسی صورت کی طرف اشارہ ہے۔ آزادی دور تھی انقلاب منتشر ہو رہا تھا ان سب کی مایوس کن صورتیں اس نظم میں فنکارانہ طور پر نظر آتی ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے وکٹر کیرنن کے حوالے سے اس سے قبل ایک انگریزی مضمون میں بھی اس نظم کے بارے میں اشارے کئے ہیں۔ اسی مضمون کا ہندی ترجمہ آجکل (ہندی) میں شاملِ اشاعت ہے۔ اس مقالے کے چند جملے اردو میں پیش کرتا ہوں۔

''اس نظم کے ذاتی جذبات و احساسات کو وسیع
تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کیرنن نے اپنے ترجمہ میں
اشارہ دے رکھا ہے کہ بڑا کمرہ نہ صرف شاعر کے احساس

میں ہے بلکہ پرانی تہذیب اور معاشرہ کا بکھر جانا ہے۔
اگلا مصرعہ ....''سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک
راہگذار''..تحریک آزادی کے مختلف اقدام کے ناکام
ہونے کی طرف اشارا کرتی ہے۔ یہ امیج اگلے مصرعہ سے
اور اثر کاری ہوئی ہے۔''اجنبی خاک نے دھندلا دئے
قدموں کے سُراغ''......اجنبی خاک یہاں سامراج
کے دھندلے ہوئے اثرات کی طرف کامیاب اشارہ
کرتی ہے۔ (نوٹ۔ اجنبی لفظ علامت ہے غیر ملکی
حکومت کی) نظم کا آغاز امید کی کرن کے ساتھ ہوتا ہے۔
''پھر کوئی آیا دل زار'' اور ناامیدی کی دُھن پر ختم ہوتی
ہے۔''اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔'' اصلاً یہ
بھارت کے بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے خاتمہ اور
چوتھی دہائی کی ابتدا کی مایوس کُن صورتِ حال ہے۔''

ملاحظہ کیجئے وکٹر کرنین کے خیالات جو ظاہر ہے کہ اردو یا ہندی کا ادیب نہیں
ہے۔انگریزی کا ادیب ہے اور فیض کی شاعری کا مترجم ــــــ انگریزی کے ایک
اور ادیب فکشن نگار اور فیض کے ساتھی ملک راج آنند تو اس نظم کو مزید وسیع تناظر میں
دیکھتے ہیں۔ ۳۹ء کے آس پاس دوسری جنگِ عظیم کا موحول تھا۔ عالمی سیاست پر
نازیوں کا قبضہ تھا۔ دنیا جنگ میں اسیر تھی اور ترقی پسند طاقتوں کی شکست ہو رہی تھی۔
فیض پر ہی مضمون لکھتے ہوئے ملک راج آنند نے اس کیفیت کو یوں پیش کیا ہے۔

''مجھے یاد ہے کہ ہم میں سے کئی کشمکش کی حقیقت
میں جی رہے تھے میں اپنے رہنما جواہر لال نہرو
اور پرانے دوستوں سجاد ظہیر، محمد تاثیر، فیض ہیرن مکرجی
اور وشنو دے سے ملا۔ ہم سب اسپین کی شکست کی وجہ

سے صدمے میں تھے۔''

آخری جملہ قابلِ غور ہے......''ہم سب اسپین کی وجہ سے صدمے میں تھے۔''
اور آگے وہ لکھتے ہیں ___

''ہم جانتے تھے کہ جنھوں نے مشین گن اور گن کھوٹ کی مدد سے سامراج پر فتح حاصل کی ہے وہ بھی جنھوں نے Knupp اور Schuciber کے ذریعہ فتح حاصل کی تھی۔ جنگ کے ان نئے ہتھیاروں کو سامراجی ارتقا کے لئے استعمال میں لا رہے تھے انھیں ظاہری طور پر گاندھی کے عدم تشدد تحریک سے نفرت تھی۔ ہماری نظریاتی کمزوری کو ہماری اخلاقی کمزوری مان لیا گیا۔ قانون سے پرے ہم نیچ ذات کے تھے۔ تمام نظریات بکھر گئے۔ تمام ہیرو مادام تو ساد کے موم کے پتلے بن گئے۔ تمام دنیا تاریکی میں ڈوب گئی۔ فطری بات ہے کہ فیض احمد فیض اس حالت سے متاثر ہوئے۔''

ایک جملہ اور ملاحظہ کیجئے۔''یہ یقین کو بدل دینے والی بات تھی۔ فیض میں پھر بھی ناامیدی کی لہر نہ تھی اگر چہ اُس نے شکست تسلیم کر لی تھی۔''

خود فیض نے اپنے ان مخصوص ولمحاتی شکست خوردہ احساسات کے بارے میں کئی جگہ لکھا ہے۔ اپنی ذہنی کشمکش کا اظہار کیا ہے۔ ایک مضمون ''فیض از فیض'' میں لکھتے ہیں ۔

''دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک چھاننے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھ گئی اجڑے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی

خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر
یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگِ سوز محبت کا کہرام مچا تھا
یکا یک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی رستے
بند ہو گئے اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔''

(دیباچہ دست تہہ سنگ)

ان مثالوں سے بہت حد تک یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظم تنہائی محض فلسفۂ تنہائی یا محبوب کی جدائی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس نظم کے باطن میں ملکی و غیر ملکی سیاست کا انتشار و حالات کا بگاڑ اور اس سے متعلق ایک حساس و سنجیدہ اور نوجوان شاعر کے جذبات موجزن ہیں اور چونکہ وہ ابھی ابھی غزلوں کی مخصوص عشقیہ فضا سے نکل کر نظم کی طرف آیا ہے اس لئے اس کے تخلیقی وجدان میں غزل کا پیرایۂ اظہار رچا بسا ہے۔ انھیں حالات کو لے کر جہاں وہ اس طرح کے غزل کے اشعار کہہ رہا ہے ؎

موت اپنی نہ عمل اپنا نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا

اپنے اجداد کی میراث سے معذور ہیں ہم
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے کو مجبور ہیں ہم

مجھے تو آ کے ملی وقت کے دوراہے پر
کہ صبح زیست بھی اور موت کی گھڑی بھی ہے

یہی نہیں فیض نے تقریباً انھیں خیالات کے آس پاس ایک اور نظم کہی جس کا عنوان ''یاس'' ہے جو نسبتاً کم مشہور ہے۔

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے

چھنِ گیا کیفِ کوثر و تسنیم

زحمتِ گریۂ و بُکا بے سود
شکوۂ بختِ نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول

بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم

ان سب باتوں کے باوجود ان اشعار میں وہ رچاؤ اور کساؤ نہیں ہے جو تنہائی کے حصہ میں آیا اور وہ ایک شاہکار نظم ہوگئی۔ محض نو مصرعوں پر مشتمل یہ نظم اپنے آپ میں چند خوبصورت لفظیات و اصطلاحات میں جذب و پیوست ہے دلِ زار، راہ رو، تاروں کا غبار، خوابیدہ چراغ، قدموں کے سُراغ، مے مینا و ایاغ، بے خواب کواڑ وغیرہ ایسی دلنشیں ترکیبیں ہیں جو عام طور پر دامنِ دل کھینچتی ہیں اور بادی النظر میں معاملاتِ قلب و جگر اور وارداتِ عشق و جمال ہی اپنے گھیرے میں لیتے ہیں۔اسی لئے اکثر اس نظم کو رومانی احساس کی نظم کہا گیا اور محبوب کے انتظار سے وابستہ کر دیا۔ نظم کی پہلی قرأت یا سرسری مطالعہ فطری طور ایسا سوچنے پر مجبور کرتا ہے.......ایسا اس لئے بھی ہے بقول کلیم الدین احمد ______

''وہ افکار و جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتے۔ افکار و جذبات پر ضبط کی مہریں لگاتے ہیں۔ دوسرے شاعروں کی طرح پہلے فیض بھی رومانی تجربوں سے کھیلتے ہیں۔ اس نظم میں چند خارجی تصویریں ہیں لیکن ان سے اداسی کی شدت ٹپکتی ہے اور اس شدت کے باوجود ضبط ہے۔ اس باالواسطہ طریقِ کار سے احساس کی شدت بھی رہتی ہے اور اس پر قابو بھی رہتا ہے۔ اردو شعراُ اس گُر سے واقف نہیں۔''

اور آگے وہ لکھتے ہیں ۔

''تنہائی میں اردو نظم نے غزل سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔''

ساتھ ہی وہ اپنے مخصوص مزاج کے مطابق یہ کہنے سے بھی پیچھے نہیں رہتے ۔

''تنہائی فیض کی بہترین نظم ہے لیکن ہارڈی کی ''دی بروکن اپوائمنٹ'' سے بہت پیچھے ہے۔''

ہوسکتا ہے یہ بات سچ ہو لیکن یہ سچ نہیں ہے کہ اس نظم نے غزل سے پیچھا چھڑا لیا ہو اس لئے کہ فیض کا عشقیہ و غزلیہ انداز ہی اسے ایسی خوبصورت نظم کہنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ واضح طور پر سیاسی انداز نہ اختیار کر کے ایسی خوبصورت نظم کہنے پر مجبور کرتا ہے۔

فیض کا شاعرانہ کمال یہی ہے کہ معاملہ دل کا ہو یا دنیا کا۔ سیاست اور سماج کا وہ ہر ایک کو ایک مخصوص رومانی و جمالیاتی احساس اور رچاؤ کے ساتھ پیش کرتے ہیں اسے اپنے اندرون میں جذب کر کے ایک مخصوص تخلیقی زبان عطا کر کے اسے ایسی گہرائی و گیرائی عطا کر دیتے ہیں جہاں عشق محبوبی اور عشق دنیاوی کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ اس دور کی نظم ہے جب وہ ایک نئی حقیقت سے دوچار ہو رہے تھے۔ ایک نئی معاشرت جس کے لئے انھیں ایک نئی جمالیات بھی پیدا کرنی تھی۔ روایت سے الگ بھی نہیں ہونا تھا۔ محبوب کا دامن اچانک چھوڑ دینا ان کے بس کی بات نہ تھی اسی لئے وہ اکثر یہ بھی کہتے رہے ہیں دنیا کا غم جہان کا غم سب تری محفل سے آئے ہیں لیکن یہ محض ایک شاعرانہ خیال ہے حقیقت یہ ہے کہ فیض کی اُداسی و مایوسی صرف محبوب کی جُدائی تک محدود نہیں ____ سوال یہ بھی ہے کہ شاعر کے تجربات کیا صرف ناکامئ عشق کے مرہونِ ہوتے ہیں یا افسردگی و مایوسی کا سبب ملک و معاشرہ اور تاریخ کے زخموں، دکھوں سے شاعر کی وابستگی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نظم میں اُداسی کے پس منظر میں کوئی ایک خاص واقعہ یا اثر کام کر رہا ہو لیکن عام طور پر فیض جیسے کمٹیڈ شاعر کا ذہن دوسری عالمگیر جنگ، تحریکِ آزادی، تقسیم ہند، جمہوریت کا خاتمہ، امیر و غریب کا فاصلہ، دنیا میں پھلتی سرمایہ داری، استحصال، ظلم و ستم سب کہ سب فیض کے

دکھوں کا سبب ہیں۔

اس نظم کو اور بہتر طور پر سمجھنے کے لئے فیض کے تصورِ شعر اور نظریۂ شاعری کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ ایک گفتگو میں مسعود اشعر کا سوال تھا......''اگر کوئی منزل اور کوئی گول سامنے ہو تو اچھا ادب پیدا ہوتا ہے۔ مایوسی، محرومی اور تشکیک کے ادب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

فیض کا جواب تھا ____

''اس بارے میں دو باتیں ہیں یعنی تشکیک بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک منفی اور دوسری مُثبت۔ ایک تو منفی تشکیک ہے جس کے ذریعہ آپ منفی ادب پیدا کرتے ہیں اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ایک مُثبت تشکیک ہوئی جس میں واقعی کسی چیز کو Question کرتے ہیں اس کے بارے میں تجسس، تفتیش اور تحقیق کرتے ہیں اسے حقیقت اور واقعہ سے الگ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ بھی ایک طرح کا احتجاج ہے صورتِ حال کے خلاف اگر احتجاج واقعی جانبدارانہ ہے اور اس میں خلوص اور جذبہ ہے تو وہ ٹھیک ہے لیکن اگر وہ محض منفی چیز ہے تو اس میں کوئی جان نہیں ہوگی۔''

اس بیان کے تناظر میں اس نظم میں پائی جانے والی تشکیک اور مایوسی کے جواب از خود مل جائیں گے۔ اس نظم میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور جو لفظیاتی روش ہے اس میں ایک خاص قسم کی پُراسراریت بھی نظر آتی ہے اس کے پیچھے بھی فیض کا اپنا رویہ اور نظریہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ متعدد گفتگو میں انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اولاً حسرت موہانی اور اختر شیرانی کی رومانیت سے متاثر رہے ہیں لیکن جب وہ انگریزی شاعری کے مطالعہ میں آئے تو جس شاعر نے فیض کو سب سے زیادہ متاثر کیا

وہ براؤ ننگ تھا۔ایک جگہ کہتے ہیں ....''براؤ ننگ سے ہم نے براہ راست چیز کی ہےاوروہ ہے''ڈرامیٹک مونولاگ'' کہ بات کسی کی ہور ہی ہولیکن واحد متکلم میں۔''

ایک انٹرویو میں ایک سوال اور تھا ....''آپ نے آہنگ کا جو خاص نظام اپنایا ہے اس کے پیچھے بھی کسی کا اثر ہے کیونکہ وہ بھی ایک منفرد سا ہے آپ جس طرح لفظوں کی تکرار کرتے ہیں لفظوں کے جوڑے بناتے ہیں ؟''

مثلاً اسی نظم میں دیکھئے.......'' پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں''

''اب یہاں کوئی نہیں۔کوئی نہیں آئے گا''

فیض کا جواب تھا.......''دو باتیں ہیں ایک تو لفظوں کی صوت کا مسئلہ ہے کیونکہ شاعری میں لفظ اور معنی ساتھ ساتھ ہوتے ہیں (یہ بات معنی سے الگ محض حرف و لفظ کے اسلوب پر گفتگو کرنے والے نقادوں کو سوچنا چاہئے) ہمارے ہاں ایک ہی بڑے شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے صوت کی طرف توجہ دی اور وہ تھے غالب کسی نے ان کی شاعری کے اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ وہ اس معاملہ میں بہت ہی صناع ہیں۔الفاظ کی اصوات مرتب کرنے میں انھوں نے بہت ہی مہارت سے کام لیا ہے لیکن اس کا سب سے بڑا صناع ہے حافظ یہ قصہ وہاں سے چلتا ہے ____ ایک ہمارے دوست خورشید انور نے ہمیں موسیقی کا شوق جگایا حالانکہ موسیقی کا فن جو ہے اس کا شاعری کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں، تعلق اس قدر ہے کہ آدمی کے کان اتنے حساس ہو جائیں کہ وہ جان لے کہ کوئی لفظ بے سُرا تو نہیں ہے جیسے گانے کا سُر ہوتا ہے ویسے ہی شعر کا بھی ہوتا ہے جیسے گانے میں غلط سُر لگ جائے تو آدمی بے سُرا ہو جاتا ہے ایسے ہی لفظ غلط آ جائے تو...............تو کچھ اس وجہ سے اور کچھ انگریزی شاعری کی وجہ سے ہمارے ہاں یہ رنگ پیدا ہوا ہم نے کچھ ادھر کچھ اُدھر دیکھا پھر یہ بھی دیکھا کہ لفظوں کے صرف معنی ہی نہیں ہوتے صوت بھی ہوتے ہیں چنانچہ ہم نے دونوں چیزیں ملا کر بات کی........''

حرف وصوت، اسلوب و آہنگ کے متعلق فیض کے یہ بیانات قابلِ غور ہیں

اور یہ بھی کہ بڑے سے بڑے ساجی، سیاسی اور انقلابی موضوعات کو بھی کس طرح فیض نے رومانیت اور غنائیت کا لبادہ پہنا دیا۔ لیکن غنائی شاعری کی جہاں اپنی خوبصورتی ہوتی ہے وہیں ایک کمزوری بھی۔ بقول اقبال حیدر ______ ''غنائی شاعری کی مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ اکہری معنویت سے آراستہ ہوتی ہے وہ شعور اور ادراک میں Tangent نہیں لگاتی جبکہ شعوری فروغ فکر کا سفر پھلتا ہی Tangent کی بنیاد پر ہے۔'' ہر چند کہ فیض کی شاعری کے ساتھ ایسا کم کم ہی ہوتا ہے تاہم ان کی شعری جمالیات میں جو ایک دلنشیں عنصر وانبساطی کیفیت پائی جاتی ہے کبھی کبھی وہ ایک ملگجا سا اندھیرا ڈال دیتی ہے اور یہ بھی ہوا ہے کہ فیض کا غیر معمولی حسن بیان، حسن معنی کو قربان کر دیتا ہے اس لئے اکثر یہ ہوا ہے کہ شاعری کی دلنشینی اس بات کا اندازہ نہیں لگانے دیتی کہ شاعر تخلیق وتفکیر کے کس کرب سے گذرا ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال تنہائی ہے۔

ان خیالات کی روشنی میں اس نظم کے اسلوب کو بھی سمجھا جا سکتا ہے حالانکہ یہ نظم ان کی دیگر نظموں کے مقابلے کچھ زیادہ ہی رومانیت پُراسراریت رکھتی ہے۔ اسی لئے کچھ جدید نقادوں کو یہ نظم زیادہ ہی پسند آئی کیونکہ وہ اس میں انفرادی داخلیت تلاش کر لیتے ہیں اور داخلیت سے انکار بھی ممکن نہیں لیکن داخلیت تو ہر تخلیق میں کسی نہ کسی انداز میں ہوتی ہی ہے میرا ناقص خیال ہے کہ داخلیت اپنے آپ میں کوئی الگ تھلگ یا مجرو شے نہیں ہوتی۔ خارجیت ہی جذب ہو کر داخلیت کا روپ لے لیتی ہے۔ فطرت کا اپنا ایک ضابطہ ہوا کرتا ہے۔ فطرتِ ذہنی اور جسمانی دونوں ایک خاص نفسیاتی جبلت کے مرہون ومربوط ہوتے ہیں۔ دونوں کا ایک بے نام ربط ہوتا ہے جو غیر محسوس طریقہ سے اپنے رشتے استوار کرتا رہتا ہے۔ فیض بھی ایک جگہ کہتے ہیں ؎

''انسان کی اپنی ذات تو حقیری چیز ہے۔ اندر
سے تم کیا نکالو گے۔ اندر جو کچھ ہے وہ تو باہر ہی سے
آتا ہے تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ باہر کیا ہے۔ باہر

کے بھی تین حلقے ہیں ایک تو اپنی ذات کا حلقہ ہے۔
آپ پر خود کیا گذری اور آپ پر جو گذری ہے اس کا
آپ کی قوم پر کیا اثر ہوا۔ دوسرا اپنے ماضی حال اور
مستقبل پر بھی نظر رکھنا چاہئے اور یہ مستقبل میں ہمیں
کون سے راستے پر چلنا ہے اس پر بھی نظر رکھنی چاہئے
پھر جا کر کہیں بڑی شاعری بنتی ہے جس سے معاشرے
کی خدمت ممکن ہوتی ہے۔''

فیض بنیادی طور پر صحت مند تصور اور امید افزا خیال کے انسان اور شاعر تھے۔ وہ مایوس کن حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ان کا گہرا مطالعہ، زندگی پر بھر پور یقین، جدوجہد، حرکت وحرارت پر اعتماد انھیں بھٹکنے نہیں دیتا۔ ان کی تربیتِ ذہنی اور تہذیب فنی نے ایک ایسا اشتراک و امتزاج پیدا کر دیا ہے کہ جہاں فکر وفن اور رنگ و آہنگ شیر وشکر ہو گئے ہیں۔ کچھ اس انداز سے کہ تنہائی جیسی نظم بھی جو نسبتاً زیادہ مایوسی اور محرومی کا شکار ہوگئی ہے وہ بھی اپنے اسلوب و آہنگ کی بنا پر اردو کی عمدہ نظموں میں شمار کی گئی۔ یہ عمدگی اور پسندیدگی اس لئے بھی ہے کہ انسان ہمہ وقت پرچم برداری بھی نہیں کرسکتا۔ فطری طور پر ا ے اور کبھی مایوسی اور کشمکش کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ فیض پریشان نہیں ہوئے۔ الجھنوں کا شکار بھی ہوئے لیکن ان کے اندر کا شاعر یہ بھی سوچتا رہتا ہے ۔

''ہنگامی شاعری اور ایجی ٹیشنل شاعری کا بھی ایک
مقام ہے لیکن وہ وقتی ہوتا ہے ہونا یہ چاہئے کہ دیرپا چیز
سامنے آئے اور اس میں صنعت اور فن کے تقاضے بھی
پورے کئے جائیں ایسی چیز پیدا ہو جو نظریہ کے اعتبار سے
بھی صحیح ہو اور ساخت کے اعتبار سے بھی۔''

''شاعر اگر دراصل شاعر ہے تو اس کا موضوع سخن

خواہ کچھ بھی ہو اس میں فنکارانہ بانکپن ضرور ہوگا۔''

ایک مضمون میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

''ایک فنکار حیات کے تین اہم دائروں میں گھومتا ہے۔ پہلا دائرہ اس کی اپنی مادی اور موضوعی شخصیت ہے۔ دوسرا دائرہ اس کی برادری اور قوم کا ہے اور تیسرا دائرہ انسانیت کے اس دور کا جس میں وہ رہتا ہے ___ حیات کے یہ تین دائرے ہی وہ حقیقت ہے جس کا وجود فنکار کے لئے اہمیت رکھتا ہے اور یہی اس کے لئے صداقت کا ماحصل ہے۔ حقیقت اور صداقت کا یہ ادراک اور احساس فنکار کے لئے کئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یہ کہ اشیاء اور ان کے باہمی تعلق کی صورت میں داخل ہوتا ہے۔ کبھی تاریخ کے علت و معلول کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ کبھی عروج و زوال کی تفسیر بن کر نمودار ہوتا ہے۔ کبھی تصادم کی تصویر دکھاتا ہے لیکن خوش آہنگ کبھی بے آھنگ۔''

نظم تنہائی جو بظاہر ذاتی سی لگتی ہے سچ یہ ہے کہ اس میں تینوں عکس نظر آتے ہیں اس نظم کو اسی وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ سلامت اللہ خاں کی اس خیال پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

''یہ نظم محض انفرادی نہیں ہے۔ تنہائی اور انتظار جس کا اظہار فیض نے کیا ہے وہ صرف شاعر کا نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پوری ہندوستانی قوم کا ہے۔ اور یہ فضا پورے عالمِ انسانیت پر محیط ہو سکتی ہے ___''

ہندی کے ایک ممتاز نقاد وجے موہن سنگھ فیض پر ہی ایک مضمون میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

''فیض صرف محبوب اور مہتاب کے شاعر نہیں
ہیں اور نہ ساقی مے اور مینا کے ان کی شاعری کا سفر
نامہ بہت لمبا ہے.............
اچانک ایک رسالہ میں میں نے ان کی نظم تنہائی پڑھی
۔ یہ نظم کہنے کا ایک نیا انداز تھا۔ شاعر یہاں خود سے
ہی بات چیت کر رہا ہے خود سوال کر رہا ہے، خود
جواب دے رہا ہے اور آخر میں مایوس ہو کر کہتا ہے
___ ''اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
''___ بے انتہا تنہائی میں لکھی یہ نظم شاید صرف کسی
آدمی کا یا تنہائی میں کسی سنگ ساتھی کا ہی انتظار نہیں کر
رہی ہے بلکہ اس کے انتظار کا اصلی مطلب تب کھلتا
ہے جب فیض لکھتے ہیں ___ یہ داغ داغ اجالا یہ
شب گزیدہ سحر/ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
___ فیض کی یہی خوبی ہے جو انہیں باقی شاعروں
سے الگ کرتی ہے۔ یہی غمِ جاناں کے غمِ دوراں میں
تبدیل کر دینے والی خوبی ہے۔

فیض بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے۔ لیکن فیض کی رومانیت کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ وہ اپنی عشقیہ شاعری میں بھی ڈی پرسنالائنز کر کے یا اپنے سے باہر نکل کر خود کو دیکھ پاتے ہیں۔ دنیا یا زندگی محض عشق تک محدود نہیں ہے۔ فیض خود تو اس محدود دائرے سے باہر جاتے ہی ہیں اردو شاعری کو بھی بڑے دائرے میں لے جاتے ہیں۔''

فیض کے تنقیدی رویّے
(فکشن کے حوالے سے)

ممتاز حسین نے فیض کے بارے میں ایک جگہ لکھا تھا:

''فیض جب بھی محفل میں آئے ، ایک چھوٹی سی کتاب ، ایک قطعہ ، کسی نامکمل غزل کے چند اشعار ، کچھ مشقِ سخن اور کچھ معذرت لے کر آئے اور ہر بار کامیاب آئے'' .... (فیض نمبر۔فن اور شخصیت)

اہلِ علم واقف ہیں کہ فیض کا سرمایۂ شعری کم ہے اور نثر کا سرمایہ اس سے بھی کم ....کچھ دیباچے ، کچھ مضامین ، کچھ خطوط یا کچھ خطبات وغیرہ۔ یہ سب کچھ اپنی کمیت کے اعتبار سے زیادہ نہ سہی لیکن فکر و خیال ، نظر و نظریہ کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں۔ ان کے بغیر فیض کی شاعرانہ و دانشورانہ شخصیت کو سمجھ پانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

ان کے مجموعۂ مضامین ''میزان'' میں ویسے تو نظریہ ، مسائل ، متقدمین ، معاصرین کے عنوان سے تقریباً تیس مضامین شامل ہیں جن میں چند ایسے بھی ہیں جنہیں مضمون یا مقالہ نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ وہ تحریریں فیض کی ہیں اس لیے شاملِ اشاعت ہیں۔ اس کے برعکس بعض مقالات مثلاً ادب کا ترقی پسند نظریہ ، شاعری کی قدریں ،

خیالات کی شاعری، اردو شاعری کی پرانی روایتیں اور نئے تجربات، غالب اور زندگی کا فلسفہ، اقبال اور جوش پر مضامین ایسے ہیں جن سے بحث وبصیرت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور جن پر لمبی گفتگو کی جا سکتی ہے۔ تنگیٔ وقت اور محدودیت کے پیشِ نظر اس ہیچمد ان نے ان کے فکشن سے متعلق مضامین کو ہی موضوع بحث بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش اس لیے بھی کہ اردو کی ادبی وتہذیبی روایت عجیب وغریب رہی ہے۔ یہاں ایک عرصہ تک عموماً ادب کا مطلب شاعری اور شاعری کا مطلب غزل گوئی سمجھا جاتا رہا ہے۔ نثر کسی اور دنیا کی چیز سمجھی جاتی رہی۔ حالانکہ انیسویں صدی میں ہی کچھ شاعروں اور ادیبوں نے اس تصوّر کو توڑنے کی کوشش کی۔ حالی، شبلی، آزاد وغیرہ کی ان کوششوں کو بیسویں صدی میں فیض، فراق، سردار جعفری وغیرہ نے آگے بڑھایا۔ اس لیے کہ یہ سب کے سب صرف اور صرف شاعر نہ تھے بلکہ مفکر تھے، دانشور تھے اور شعروشاعری کو محض تذکیروتانیث، واحد جمع میں الجھائے رکھنے کے بجائے حیات وکائنات کے حوالے سے دیکھتے تھے۔

فیض نہ صرف ترقی پسند تحریک کے بلکہ اقبال، جوش کے بعد اس عہد کے سب سے ممتاز، مقبول اور اہم شاعر تھے جنہوں نے کم عمر سے ہی اپنی شاعری کا لوہا منوایا۔ بھرے شباب میں، بلکہ بھرے عشق میں وہ محبوب کی زلفوں سے نکل کر گیسوئے حیات کو سلجھانے میں مصروف ہوگئے اور اس کم عمری کے دور میں ادب کے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے جن میں فکشن سے متعلق ان کے چار مضامین ہیں جن کے عنوانات یوں ہیں: 'اردو ناول'، 'رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری'، 'شرر' اور 'پریم چند'۔

یہ چار مضامین ۳۹ء اور ۴۵ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ اس وقت فیض کی عمر اور اس کے ساتھ ساتھ اُس عہد کی زندگی، عالمی کساد بازاری، دوسری جنگِ عظیم، ہندوستان کی جنگِ آزادی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام وغیرہ سے الگ کر کے ان مضامین کی تفہیم ممکن نہیں۔ یہ وہ دور تھا جب ادب کو سماج سے الگ کر کے دیکھ پانا ممکن ہی نہ تھا بالخصوص افسانوی ادب کو۔ اسی لیے اردو ناول کا مضمون اس جملے سے شروع ہوتا ہے........''ادب کی تاریخ ہماری سماجی تاریخ ہی کا ایک حصہ ہے۔'' اور آگے لکھتے ہیں............''ادب

سماج کے اجتماعی فکر کی پیداوار ہوتا ہے۔اس کے فکر کی صورت بدلتی ہے تو ادب کا رنگ بھی دوسرا ہو جاتا ہے......''

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں شاید اردو ادب میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ انسان طبقاتی حصّوں میں ہی نہیں طبقاتی شعور میں تقسیم ہو گیا۔ان کے اپنے اپنے جذباتی و معاشرتی مسائل تھے جنہیں وسیع تناظر میں سمجھنے کا عرفان پہلی بار ہوا۔ظاہر ہے کہ ان کے باطن کا یہ احساس عالمگیر انسانی اور اخلاقی اتھل پتھل کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔افکار و اقدار کی پامالی،انسانی زندگی کے خطرات،انسان کی انسان سے جنگ، جبر و اختیار، مجبور و مختار کے آثار و آزار نے انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کیا۔اس تمام صورتِ حال کی بہترین عکاسی جس قدر فکشن میں ہوئی،شاعری میں اس شکل میں نہ ہو سکی۔ایسا اس لیے بھی ہوا کہ شاعری کے مقابلے میں ناول زندگی کو زیادہ وسیع، شفاف (Transparent)اور شاید کھردرے انداز میں دیکھتا اور دکھاتا ہے۔اسی لیے فیض صاف طور پر کہتے ہیں کہ ناول کی سب سے بڑی دین متوسط طبقہ کی دریافت ہے اور یہ دریافت سماجی فکر کی سب سے بڑی دریافت ہے۔جن ناولوں میں یہ طبقہ آیا ہے اور پورے فکر و شعور کے ساتھ نہیں آیا ہے،فیض اس کی مذمّت کرنے میں تامل نہیں برتتے۔وہ سستے رومانی، جاسوسی ناولوں کی خوب خوب خبر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دور کے ناول نئے دور کی نمائندگی نہیں کرتے۔نئے دور کے بدلتے ہوئے سماجی احساس کی ترجمانی نے سب سے پہلے واقعیت کے سماجی مفہوم کو اتنی وسعت دی کہ اسے صحیح معنوں میں واقعیت کہا جا سکے۔فکشن میں واقعہ نگاری کی بڑی اہمیت ہے جس نے آگے بڑھ کر اپنی ترقی یافتہ شکل میں واقعیت کی اصطلاح قائم کر لی۔لیکن یہ واقعیت بھی ایک زمانے تک ایک خاص معنوں میں محدود و مشروط رہی۔مثلاً نذیر احمد کے یہاں واقعیت کرداری ہے۔صرف کردار آتا ہے۔اس کی کمزور پیش کش طبقاتی شعور سے محروم رہ جاتی ہے۔اس کے برعکس امراؤ جان ادا یا پریم چند کے ناول کے کردار صرف کردار نہیں ہوتے بلکہ پورے طبقہ کی علامت ہوتے ہیں۔فیض کی سماجی فکر اس

سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر یہ اعلان کرتی ہے۔:

''کسی ایک طبقہ کی ترجمانی، خاص طور سے جب
وہ طبقہ سوسائٹی یا سماج کا بہت ہی چھوٹا طبقہ ہو، صحیح
معنوں میں واقعیت نہیں۔ واقعیت کا صحیح مفہوم اس
وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک لکھنے والا سماج
کے کونے چھدرے کھنگالنے میں سماج کو مجموعی
حیثیت سے نہ دیکھے۔ اس نوع کی واقعیت صحیح
عوامی یا جمہوری شعور کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔''

(اردو ناول)

جز و میں کل دیکھنے کا یہ صوفیانہ مزاج تو فیض کے یہاں ابتدا سے ہی تھا، لیکن سماج کو ایک مکمل اکائی اور مادی وحدت کا وژن ان کی اشتراکی نقطۂ نگاہ کا دین تھا جو ایک فکر، ایک فلسفہ بن کر صرف فیض کو ہی نہیں بلکہ اس عہد کے بیشتر تخلیق کاروں کو متاثر کر رہا تھا اور حیات کی تفسیر، تنقید میں مسئلہ حیات، فلسفۂ حیات میں۔ ماورائیت، ارضیت میں۔ انفرادیت، اجتماعیت میں بدل جانے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے وقت سے اردو ناول کا مزاج ہی نہیں کینوس بھی بدل جاتا ہے، اس لیے کہ انہوں نے زیادہ واقعیت سے کام لیا تھا۔ لیکن فیض پریم چند کی واقعیت سے بھی مطمئن نہ تھے اور ان کا جوشیلا اشتراکی نظریہ، پریم چند پر بھی اعتراض کرنے سے روک نہیں پاتا۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ پریم چند اردو ناول کو سفید پوش شرفاء کی بیٹھکوں سے نکال کر دیہات کے چوپالوں میں لے گئے۔ لیکن جب وہ الگ سے پریم چند پر باتیں کرتے ہیں تو خاص طور پر کہتے ہیں:۔

''حقیقت ایک جامع چیز ہے اور اس کی وضاحت وہی شخص کر سکتا ہے جس کے ذہن میں سماج کا مجموعی تصور موجود ہو اور پریم چند کے ذہن میں یہ تصور موجود نہ تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن کے متعلق نہ صرف پریم چند خاموش رہتے ہیں بلکہ دانستہ طور پر ان سے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اور جو کچھ

بھی ہوں، حقیقت نگار ہرگز نہیں کہلا سکتے۔''

پریم چند ۱۹۳۶ء میں فوت ہو گئے۔ ۱۹۴۱ء میں آغا عبدالحمید سے یہ گفتگو کی گئی ۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت ترقی پسند حلقہ میں پریم چند کا طوطی بول رہا تھا۔ ایسے میں پریم چند جیسے شہرت یافتہ ناول نگار پر اس قسم کی نکتہ چینی کرنا، وہ بھی ایک نوجوان شاعر کے لیے، حیرت اور جرأت کی بات ہے۔ وہ اسی جرأت سے مزید یہ کہتے ہیں:۔

''فنی طور پر انسانی جسم اور اس کی ازلی خواہشات کے متعلق پریم چند کو یا تو کچھ معلوم نہیں ہے یا وہ اس کے متعلق کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتے، حالانکہ کھانے کے بعد جنسیات کا مسئلہ انسانی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ ہے۔ مثال کے طور پر ''چوگانِ ہستی'' لے لو۔ صوفیہ اور ونے سنگھ کی محبت بالکل بچوں کی سی محبت ہے، لیکن وہ دونوں باقی معاملات میں کافی پختہ کار ہیں۔ ایک اور چیز........ پریم چند مذہب اور سماج کے بعض اصولوں کو بغیر سوچ بچار کے درست مان لیتے ہیں۔ بعض رواج ایسے ہوتے ہیں جو کسی سماجی ضرورت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد سماجی حالات کے بدلنے سے ان کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن سماج میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ انہیں ترک کر دے اور لوگ انہیں ایک بیکار بوجھ کی طرح اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ مثلاً عورت کے متعلق پریم چند کا نظریہ کہ ان کے نزدیک مثالی عورت وہ ہے جو کسی اصول کے لیے اپنی جان تک قربان کر دے خواہ وہ اصول غلط ہی کیوں نہ ہو۔ قربانی پر پریم چند بہت زور دیتے ہیں۔ زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر دنیا کو تیاگ دینا ان کے نزدیک قابلِ احترام بات ہے حالانکہ موجودہ حالات میں یہ قربانی بہادرانہ نہیں بزدلانہ بات ہے۔''

اور پھر آخر میں یہ بھی کہتے ہیں:۔

''بات یہ ہے کہ پریم چند بیچارے نہایت شریف
آدمی تھے اور سماجی تنقید شرفاء کا کام نہیں۔''

ان جملوں میں نوجوان اشتراکی کے باغیانہ عناصر چھلکے پڑ رہے ہیں۔ جہاں

مفاہمت کا دور دور تک نام نہیں، جہاں نوجوان امنگیں سب کچھ الٹ پلٹ کر دینا چاہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ انہیں مارکسزم کے ذریعہ حاصل ہوا تھا جو اس عہد کے نوجوانوں کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ پریم چند نے مارکسزم نہیں پڑھا تھا یا وہ اس سے متاثر نہیں ہوئے تھے، لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں اس فلسفہ کے قریب آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آخری عہد کی تحریروں میں مارکسزم یا مارکسی جمالیات نظر تو آتی ہے لیکن وہ بھی سنجیدہ اور ٹھہرے ہوئے انداز میں۔ اس کے برعکس فیض جوان ہوتے ہی مارکسسٹ ہو گئے۔ محمودالظفر اور رشید جہاں نے عنفوان شباب میں ہی مارکس کی کتابیں پکڑا دیں اور للکار کر کہا کہ دنیا سے عشق کرو، دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کے لیے جدوجہد کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ جدوجہد صرف عملی نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے ایک نظریہ تھا۔ ایک انسانی فلسفہ تھا جس نے ایک تحریک بن کر اس عہد کے تقریباً تمام شاعروں، فنکاروں کو ایک خاص قسم کے وژن اور جوش و جذبہ سے سرشار کر رکھا تھا۔ جس میں فیض بھی شرابور تھے۔ پریم چند نے آدھی سے زیادہ زندگی گاندھیائی اثرات میں گزار دی، عدم تشدد کے فلسفہ پر یقین رکھا۔ یہی وجہ ہے "ہوری" سارے مظالم برداشت کرتا ہے لیکن اپنے سنسکاروں سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر پاتا بلکہ اس پر قربان ہو جاتا ہے۔ پریم چند کے یہاں عورت باغی کم ستی ساوتری زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ پریم چند کا یہ شریفانہ یا کہیں کہیں مفاہمت آمیز رویہ فیض کو پسند نہیں آتا اور اسی لیے وہ ان پر اعتراض کرتے ہیں اور انہیں حوالوں سے وہ ان کی واقعہ نگاری اور کردار نگاری پر کھل کر بحث کرتے ہیں۔ یہ بحث صرف فکری اور نظریاتی نہیں ہے بلکہ ناول کی ہئیت اور فن کے حوالے سے بھی اہم ہے۔ پریم چند کی زبان کے بارے میں وہ کہتے ہیں:۔

"ان کی دیہاتی زبان صرف اتنی ہے کہ حضور کو
ہجور اور مشکل کو مسکل لکھ دیا جائے اور مزے کی
بات تو یہ ہے کہ ایک ہی دیہاتی، ایک تقریر میں
ایک فقرہ دیہاتی زبان میں بولتا ہے تو دوسرا فقرہ

اچھی خاصی لکھنوی زبان میں۔''

اس بات کو فیض کوئی بڑا اعتراض تو نہیں مانتے، لیکن پریم چند پر ان کا اصل اعتراض یوں سامنے آتا ہے:۔

''وہ کبھی کبھی اپنے افسانوں میں کھلم کھلا وعظ شروع کر دیتے ہیں ۔ یوں تو کوئی آرٹ پروپیگنڈے سے خالی نہیں ہوتا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک ناول نویس کے افسانے پر دیہات سدھار کے پمفلٹ کا شبہ ہونے لگے۔''

آگے یہ بھی کہتے ہیں:۔

''محض کہانی بیان کر لینا تو کوئی ایسا کمال نہیں ہے جب تک اس میں ایک ارادی صفت، ایک بچا تُلا ڈیزائن نقشہ موجود نہ ہو۔''

پریم چند سے متعلق فیض کے ان خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات بہر حال درمیان سے نکلتی ہے کہ فیض فکر کے ساتھ ساتھ فن کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فکر کی پختگی کے بغیر فن، اور فن کی معرفت کے بغیر فکر، مکمل کردار ادا نہیں کر سکتے۔ ادب کوئی بھی ہو وہ پروپیگنڈے سے الگ نہیں، لیکن ہر پروپیگنڈا ادب نہیں ہوسکتا۔ یہ بات انھوں نے اپنی اور دوسروں کی شاعری کے حوالے سے بھی بار بار کہی ہے اور اسی لیے انھیں پریم چند کی خارجیت میں فن کا انتشار نظر آتا ہے، جو ضروری نہیں کہ درست ہی ہو۔ فکشن کی تمام اہمیت کے باوجود ان کا خیال ہے کہ اس میں پلاٹ، اس کی ساخت اور بافت میں بکھراؤ، غیر ضروری مکالمات اور پروپیگنڈے کے داخل ہو جانے کے امکانات بنے رہتے ہیں۔ لیکن ان سب بحثوں کے باوجود وہ پریم چند کو ایک سماجی اور جمہوری ناول نگار مانتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے افسانوی ادب کو سفید پوشوں سے نکال کر چوپال تک پہنچانے کا تاریخی کام انجام دیا ہے۔

سرشار اور شرر کے مطالعہ میں اگر چہ یہ مسائل نہیں ہیں تاہم ان کے تجزیے بھی دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔فیض ، سرشار کی ناول نگاری کا تجزیہ ابتداً ایک قاری کی حیثیت سے کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان کے اندر کا تاریخی اور سماجی شعور انہیں اس عہد کے اودھ میں لے جاتا ہے جو زوال پذیر ہے، جو ایک بحرانی ،عبوری اور بے مقصد زندگی کے چوراہے پر کھڑا ہے، جہاں سے ان کو کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا ہے۔فیض کس قدر مزے سے لکھتے ہیں:۔

''اس افراط وتفریط کے باوجود سرشار کی تصویر میں نوابی کے آخری عہد کے خدوخال نمایاں اور زندگی کے مطابق ہیں۔پہلی نظر میں یہ دنیا،شورو ہنگامہ ، رونق اور گہما گہمی ، راگ رنگ ، رقص و سرود،عشق و محبت ، رندی اور بے فکری کی دنیا ہے۔کہیں بٹیروں پر شرطیں بدھ رہی ہیں، پالیاں ہیں کہ میدان جنگ کو مات کرتی ہیں۔ کہیں میلوں ٹھیلوں کا ہجوم ہے۔کہیں شعرو شاعری کی محفل گرم ہے۔کہیں چانڈو پیا جا رہا ہے۔کہیں شادی بیاہ میں طائفے آرہے ہیں۔ مہمانوں میں چہلیں ہورہی ہیں........نواب، امراء،شہسوار،بٹیرباز،بھٹیارنیں، بھانڈ ٹھٹھول ، چور گٹھ کترے ، علماء ،صوفی ، افیمچی ، قمار باز، سب ایک ہمہ گیر بے مقصد دھکا پیل میں مصروف ومنہمک ہیں۔''

لیکن جلد ہی فیض کا تاریخی شعور اس نازک موڑ کی طرف لے جاتا ہے جہاں سے تصویر کا دوسرا رُخ نظر آنے لگتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں:۔

''سرشار خوب جانتے تھے کہ یہ جگ مگ، بجھتی
ہوئی شمع کا آخری سنبھالا ہے۔ یہ رقصِ محفل
موت کا رقص ہے۔ عیش و طرب محض یاس اور
خوف سے فرار کا بہانہ ہے۔ سرشار نے اس کا
اظہار یوں کیا ہے کہ ''فسانۂ آزاد'' کے تمام
کردار اور اُن کرداروں کی تمام سرگرمیاں محسوس
اور موجود ہونے کے باوجود قطعی غیر حقیقی اور غیر
واقعی معلوم ہوتی ہیں۔''

اور پھر ان کے اندر کا مارکسسٹ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے:۔

''کسی سماج یا سماج کے کسی طبقہ میں تنزّل
کیوں آتا ہے اور کیا صورت اختیار کرتا ہے۔
غالباً سب سے سیدھی بات یہ ہے کہ جب مادی
ذرائع میں ترقی ہو جانے کی وجہ سے دنیا کے
اقتصادی حالات بدلتے ہیں تو سماج کو بھی ان
کے ساتھ بدلنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی سماج یا
سماج کا کوئی طبقہ بدلنے سے انکار کردے یا اس
انقلاب کا اہل نہ ہو تو زندگی کی رَواُسے چھوڑ کر
آگے بڑھ جاتی ہے ....اس ساکن سماج
کے اردگرد دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ معاشرت
اور تہذیب کے سانچے نئے ڈھالے جاتے ہیں
لیکن پسماندہ طبقہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ
چننے میں لگا رہتا ہے.........اس بے تعلقی کا نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ اس سماج میں اس طبقہ کی سرگرمیاں

بتدریج زیادہ مہمل، زیادہ بے مقصد اور زیادہ
مضحکہ خیز ہوتی چلی جاتی ہیں۔''

اس خیال کی بنیاد پر وہ لکھنؤ کے ان سارے تفریحی مشاغل کو ایک مفروضے میں ڈھال دیتے ہیں جہاں ایک گہری بے اطمینانی، مایوسی اور کبھی کبھی فرار کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ سرشار کے فسانہ کے ساتھ ساتھ اودھ کی زوال پذیر تہذیب کا یہ نقشہ فیض کے سماجی، سیاسی اور اشتراکی افکار و خیالات کا آئینہ دار ہے جہاں تاریخ اور تہذیب اپنی مادی و اقتصادی جدلیات ایک نئی تہذیب کو جنم دے رہی ہے۔ لیکن کہنہ پرست موت کے پردے کے پیچھے بڑی سفاکی سے صرف ڈگڈگی بجا رہے ہیں۔ فیض نے سرشار کے اس ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے جو کشاکش اور تذبذب کا شکار ہے اور وہ سب کچھ 'فسانۂ آزاد' میں کہیں خوجی، کہیں آزاد اور کہیں پورے معاشرہ کے ذریعہ جلوہ گر ہوتا ہے۔ سرشار کو بھی پرانی دنیا کے جانے کا غم ہے، لیکن ان کا وصف یہ ہے کہ وہ نئی دنیا کا استقبال بھی کرتے چلتے ہیں۔ اگر ایک طرف بٹیر بازی ہے تو اخبارات بھی ہیں۔ حسن آرا اور ثروت ہے تو انگریزی مِسیں بھی ہیں۔ ریلیں اور موٹریں بھی ہیں۔ خوجی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ مضحکہ خیز شخصیت تنزل پذیر درباری طبقہ کی آخری منزل ہے۔ اسی طرح وہ آزاد کو نئے طبقہ کا نمائندہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ سرشار نے آزاد کے ذریعہ یہ کہنا چاہا ہے کہ یہی وہ طبقہ ہے جو کچھ کر سکنے کا اہل ہے۔

اسی طرح سے شرر کے ناولوں میں بھی ان کی رائے تاریخ کے حوالوں سے دلچسپ انداز میں سامنے آتی ہے۔ شرر کے یہاں تاریخ History ہے، Historicity نہیں جو مادّیت کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ لیکن ان کی یہ ہسٹری بھی فیض کی نگاہ میں کسی ایک نکتہ پر نہیں ٹھہرتی اس لیے کہ شرر اپنے ناولوں میں جو تاریخی فضا بناتے ہیں وہ ان کی زبان میں نہ کسی دور کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے اور نہ ہی کسی تاریخی شخصیت کا تصور ذہن میں بیٹھتا ہے۔ البتہ ایک دلکش رومانی فضا ضرور قائم ہو جاتی ہے اور یہ فضا عرب کی ہو سکتی ہے اور افریقہ کی بھی، لیکن وہ شرر کے ناولوں میں اس عہد کی سماجی،

تہذیبی زندگی اور اس کے بدلتے ہوئے نقشے تلاش کرنا چاہتے ہیں جس میں ان کو مایوسی ہوتی ہے اور اس کی وجہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شرر سماجی فکر نہ رکھتے تھے اور نہ ہی سماجی سروکار رکھتے تھے۔ وہ اپنے ناولوں میں دو بادشاہوں کے درمیان جنگ تو دکھاتے ہیں لیکن جہاں تک عوام اور باقی سماج کا تعلق ہے، شرر ان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ''خالص ناول نویسی کے اعتبار سے شرر کا رتبہ کیا ہے، اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ ناول زندگی کا چربہ ہوتا ہے اور شرر کے ناولوں کو زندگی سے کچھ زیادہ تعلق نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ زندگی بہت سی چھوٹی موٹی چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔ ان سب کا مطالعہ کرنا، ان کے باہمی تعلقات معلوم کرنا، اپنی اپنی جگہ پر بٹھانا، یہ کافی باریک کام ہے اور شرر باریکیوں سے بھاگتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تحریروں میں سب سے بڑا نقص ایک خاص قسم کی ذہنی کاہلی اور سہل انگاری ہے۔''

حالانکہ خود فیض اس کو معاف کر دینے کا جواز بھی نکال لیتے ہیں کہ شرر مصروف انسان تھے۔ وہ بہ یک وقت کئی شعبوں میں کام کرتے تھے۔ صحافت، معاشرت، مذہب، ادب، تاریخ، سبھی پر برابر لکھتے رہتے تھے اور ان سب پر حاوی تھی معاشرتی اصلاح، جس کے شکار نذیر احمد، شرر، راشد الخیری سبھی تھے۔ لیکن ان سب کی بھیڑ میں شرر کو جہاں بھی اپنی علمیت وصلاحیت دکھانے کا موقع ملا، وہ اپنے اثرات چھوڑنے میں کامیاب ہوئے۔ ناولوں میں 'ایام عرب'، 'فردوسِ بریں'، 'زوالِ بغداد' اُن کے اچھے اور کامیاب ناول ہیں۔ 'گذشتہ لکھنؤ' بھی ایک یادگار کتاب ہے۔ کچھ اور چیزیں بھی لیکن فیض ان کا ذکر نہیں کرتے۔ پورے مضمون میں 'فردوسِ بریں' کا نام تک نہیں آتا جس میں شیخ علی وجودی

اُس عہد کے مذہبی نظام اور حسین اُس عہد کے نوجوانوں کی دیوانگی اور پست ہمتی کی علامت بن کر آتے ہیں۔ حسین تو 'زہرِ عشق' کے ہیرو کی توسیع ہے جو خود کچھ نہیں سوچ پاتا اور عالمِ دیوانگی میں اس کا استحصال ہوتا رہتا ہے۔ یہ عمل اس پورے زوال پذیر نظام اور مردانہ سماج کی طرف تلخ اور تیکھا اشارہ ہے جس سے اس عہد کا معاشرہ گزر رہا تھا۔ فیض نے شرر کے بارے میں یہ بات بھی صاف طور پر کہی:۔

''شرر ناول نویس قصہ گو ہیں اور قصہ گوئی میں انہیں کافی مہارت حاصل ہے۔''

فیض نے قصہ گوئی اور ناول نویسی کے فرق کو اچھی طرح سے پیش کیا ہے اور اس سے انکار کر پانا مشکل ہے کہ شرر واقعی قصہ گو زیادہ ہیں۔ لیکن وہ ناول نویس تھے ہی نہیں، حتمی طور پر یہ بات کہنا شرر کے ساتھ زیادتی ہے۔ کم لوگ جانتے ہیں اور غالباً فیض کے ذہن میں بھی نہ ہوگا کہ شرر اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے پہلی بار لفظ ناول کا استعمال کیا، اپنی قصہ نویسی کو باقاعدہ ناول کا نام دیا، ورنہ اس سے قبل نذیر احمد وغیرہ نے اپنے ناولوں کو جدید طرز کی قصہ نگاری کہا ہے۔ شرر نے اپنے رسالہ ''دلگداز'' میں صنف ناول پر کئی معرکے کے مضامین لکھے ہیں جن میں صنف ناول کی اہمیت، مقبولیت اور مقصدیت پر اچھی بحثیں کی ہیں۔ یہ بحثیں اردو فکشن کی تنقید میں اپنی نوعیت کی پہلی معنی خیز اور کارآمد بحثیں ہیں۔ انھوں نے انگریزی کے ناول اور تاریخی ناول پڑھے تھے۔ اسکاٹ اور ڈیوما کے تاریخی ناولوں کو پڑھنے کے بعد ہی انھیں اردو میں تاریخی ناول لکھنے کا خیال آیا، ورنہ وہ نذیر احمد کے طرز پر 'دلچسپ' اور 'دلکش' جیسے معاشرتی ناول لکھ چکے تھے جو زیادہ کامیاب نہ ہوئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے تاریخی ناول رومانی زیادہ ہیں اور اس رومان پر بھی ایک خاص قسم کی مقصدیت اور خارجیت حاوی رہتی ہے جس سے ناول کی ساخت اور اس کا فن مجروح ہوتا نظر آتا ہے، لیکن یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ شرر کے سامنے اردو میں اچھے ناولوں کی مثالیں کم اور معاشرتی تقاضے زیادہ تھے اور پورا اردو سماج 'مسدس حالی'، 'مضامین سرسیدؔ' اور آزاد، شبلی کی نظموں کے

اردگرد گھوم رہا تھا۔ نئے اور پرانے خیالات کے تصادمات اور تضادات اس عہد کا المیہ تھے اور طربیہ بھی ....شرر بھی اسی عبوری دور کی پیداوار تھے۔ یہ کیا کم بڑی بات ہے کہ جہاں 'حجت الاسلام' جیسے کردار معاشرہ میں ہوں وہاں 'بدر النساء کی مصیبت' جیسے ناول میں شرر پردے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ 'طاہرہ' میں مولوی کے کردار کی پھکڑی اُڑا کر نام نہاد مذہبی نظام پر چوٹ کرتے ہیں اور 'زوال بغداد' جیسا ناول لکھ کر لکھنؤ کے شیعہ سُنّی نفاق پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ شرر زود نویس تھے اور کثرت نویس۔ ان کی تحریروں کی بھیڑ کے بارے میں فراق نے دلچسپ بات کہی ہے:۔

> ''شرر کے ناول آج ذرا پرانی چیزیں معلوم ہوتے ہیں اور ان کی تحریر زیادہ تر کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہم پریم چند کے ناولوں اور افسانوں اور شرر کے افسانوں سے زیادہ متاثر ہیں لیکن ذرا یہ تو سوچئے کہ سرشار کو چھوڑ کر شرر کے ہم عمر اور ہم عصر سیکڑوں ناول نگاروں میں آج کس کا نام زندہ ہے۔ کردار اور منظر نگاری اور تاریخی تخیل کی کچھ اہم خامیوں کے باوجود بھی شرر کے کئی ناول دلفریب، دلکش اور جاندار ہیں۔ اس کے علاوہ سرشار کے مقابلہ میں شرر کے ناولوں کا منظر کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ایک سرشار پہ کیا موقوف ہے اردو کے کسی دوسرے نثر نگار نے اتنے موضوعات اور اتنی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا جن پر شرر نے ہزار صفحات لکھ کر قلم ہاتھ سے ڈال دیا۔''
>
> (اندازے۔ص۔۳۲۹)

فراق کی رائے پریم چند کے بارے میں بھی ملاحظہ کرتے چلیے :۔

''ان کی عظمت ان کے ناولوں کے بعض ٹکڑوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ غالباً ناول کی پیچیدگی اور فنی دشواریاں مختلف حصّوں کا مرکزی اتحاد اور دروبست جو کامیاب ناول کے لیے ضروری ہے ان کا مرکزِ کمال نہ تھا،لیکن اس کے باوجود وہ اردو اور ہندی کے سب سے بڑے ناول نگار تھے اور ان کا شمار ہندوستان کی دوسری زبانوں کے دوچار بہترین ناول نویسوں میں تھا ......مختلف ضخامت کے ناولوں کے بعض ٹکڑے جن کی تعداد بہت ہے ان کے ماہرفن ہونے کا بہترین ثبوت ہیں اور ان میں وہ اپنی بہترین کہانیوں سے بھی زیادہ بلند ہوجاتے ہیں۔ یہ ٹکڑے الہامی انداز کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور غیر فانی عظمت کے علمبر دار ہیں۔''

(زمانہ، پریم چند نمبر۔ص۔۴۸)

عین ممکن ہے کہ فراق کی یہ مثالیں غیر ضروری سی لگیں،لیکن ان کو پیش کرنے کے دو مقاصد ہیں۔اوّل یہ کہ فراق کے مضامین بھی تقریباً اُسی دور میں لکھے گئے جب فیض نے لکھے۔فراق،فیض سے عمر میں بڑے ضرور تھے لیکن حالات اور زمانے کے پیشِ نظر دونوں کو ہم عصر ہی کہا جائے گا۔دونوں انگریزی کے طالب علم اور استاد تھے۔دونوں کی تنقید کو تاثراتی تنقید کے خانے میں لیا جاتا ہے۔ پھر پریم چند اور شرر سے متعلق دونوں کی آراء میں اس قدر بُعد اور تضاد کیوں ....؟ اس سوال کے جواب کی تلاش میں فیض اور فراق کی بنیادی فکر وتہذیب کو سمجھنا ہوگا۔فراق ہندو تھے اور کائستھ تھے۔کم عمری میں والد کی موت نے انہیں طرح طرح سے بیماریوں اور ذمہ داریوں نے گھیر لیا۔ وہ ہندو تہذیب اور سنسکرت کے رسیا تھے جس نے آگے چل کر ان کے

مذاقِ سخن کو ایک راہ دی۔ ایسا نہ تھا کہ فراق نے اشتراکیت کو پڑھا اور سمجھا نہ تھا۔ ان کی نظموں اور خطوط میں اس کے اثرات بطور خاص دکھائی دیتے ہیں، لیکن وہ اشتراکیت کی طرف دل سے مائل نہ تھے۔ اس کے برعکس فیض مسلم گھرانے کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اپنے گھر کے مخصوص مذہبی ماحول کی وجہ سے ابتداً تصوف سے آشنا ہوئے۔ روایت ہے کہ فیض نے بچپن میں ہی آدھے سے زیادہ قرآن حفظ کر لیا تھا اور ایک بار علامہ اقبال کی صدارت میں انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے سالانہ جلسے میں تلاوتِ قرآنِ پاک کا واقعہ انہیں ہمیشہ یاد رہا۔ خود لکھتے ہیں:۔

> ''میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے ایک اونچی میز پر کھڑا کر دیا گیا۔ جب میں تلاوت کر چکا تو اقبال نے بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ تم کتنے ذہین بچے ہو۔''
>
> (ہم کہ ٹھہرے اجنبی)

کینیڈا کے ایک انٹرویو میں انہوں نے صاف کہا:۔

> ''میں اپنے آپ کو ادنیٰ طریقے سے تصوف کا پیرو سمجھتا ہوں۔ اس مسلک پر تھوڑا بہت اختلاف ہوسکتا ہے ....ہماری تو ساری کی ساری تربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی اور میری شاعری کا میرے ذہنی عقائد سے کوئی تضاد نہیں ہے۔''
>
> (ادبِ لطیف۔ فیض نمبر)

صوفی ازم کے دیگر اوصاف کے ساتھ ساتھ ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کی مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر اپنی بات جرأت اور جسارت کے ساتھ کہنا سکھاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ نڈرگی اور بے باکی سے کہنے کا ہنر فیض نے اسی ماحول سے لیا ہو۔

فیض جوان ہوائے۔ انگریزی پڑھی اور انگریزی کے استاد ہو گئے اور پھر عشق میں مبتلا ہوئے۔ عین انھیں دنوں ترقی پسندی اور اشتراکیت کا شور بلند ہوا۔ محمود الظفر اور رشید جہاں نے اس عارضی عشق پر غیرت دلائی اور مارکس کی کتابیں پڑھنے کو دیں، جس کو پڑھنے کے بعد بقول فیض:۔

"یہ کتاب میں نے ایک نشست میں پڑھ ڈالی
بلکہ دو تین بار پڑھی۔ انسان اور فطرت، فرد
اور معاشرت، معاشرہ اور طبقات اور ذرائع
پیداوار کی تقسیم ....انسانوں کی دنیا کے پیچ
در پیچ اور تہہ در تہہ رشتے ناتے، قدریں،
عقیدے، فکر و عمل وغیرہ وغیرہ کے بارے میں
یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزینۂ اسرار
کی کنجی ہاتھ میں تھمادی۔"

اس طرح صوفی فیض کے بطن سے اشتراکی فیض کا جنم ہوا۔ صوفی ازم سے لے کر مارکسزم تک کا یہ ذہنی سفر انہیں اچھا لگا اور وہ اپنے آپ کو کامریڈ سمجھنے لگے، لیکن ان کا خیال اب بھی تھا کہ یہ صوفی لوگ ہی اصل کامریڈ ہیں۔ یہ ۳۵ء کا وہ زمانہ تھا جب مفکر اسلام کہے جانے والے اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال بھی اشتراکیت کے رد وقبول کے مراحل سے گزر چکے تھے اور اس کی طرف محبت اور امید کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ جوش پر فخر محسوس کر رہے تھے۔ اور پھر ان میں سب کے سامنے نئی نسل، ترقی پسند نسل کے طور پر ابھر کر آئی جو مغرب کے تمام سیاسی اور سماجی افکار و نظریات سے باخبر تھی، باعمل تھی۔ سماجی شعور، ثقافتی بصیرت، اشتراکی حوالوں سے اپنے تمام تر جوش و جذبۂ حرکت و حرارت کے ساتھ سیلاب کی طرح بہہ نکلے تھے۔ پورے نظام کو متزلزل کر دینے اور آسمان سے تارے نوچ لینے کی باتیں سوچی جانے لگی تھیں اور دنیا سے اس طرح لڑا جانے لگا تھا جیسے رابرٹ فراسٹ نے کہا تھا: "میرا اور دنیا کا جھگڑا دو پریمیوں کا

جھگڑا ہے۔'' عالمی اور قومی حالات، نت نئے نظریات اور تجربات، نئے علوم وفنون اور اشتراکی وانقلابی رجحانات نے حیات وکائنات کے افہام وتفہیم کے طور طریقے ہی بدل دیے تھے۔ بقول آل احمد سرور:۔

'' شاعر زندگی سے محبت کرتا ہے اور کبھی کبھی زندگی کے ایک بلند تصور کی خاطر اس سے ستے اور کاروباری تصور سے لڑتا ہے۔ شاعر کے خواب محض خیالی دنیا کی پرچھائیاں نہیں ہوتے۔ ان میں گہری اور تابندہ حقیقت کی کرن ہوتی ہے۔ اس کرن کی خاطر ظلمات سے ہی نہیں، سورج سے بھی لڑنے کو تیار ہوتا ہے۔ زندگی کی بصیرت اور ایک دردمند دل یہی شاعر کی دولت ہیں۔ یہ بصیرت فطرت سے ملتی ہے، مگر اس میں جلا زندگی کے سوز و ساز اور درد وداغ سے ہوتی ہے۔ میر نے کہا تھا :ے

ے اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈ وحرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر، کسی کا شکار ہو''

اس پورے پس منظر کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ فیض کی ان تحریروں کو اور خاص طور پر فکشن سے متعلق تحریروں کو اس ماحول، مزاج، عمر، ذہن اور جوش وجذبہ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ پریم چند پر ان کے اعتراضات روشنی کے سورج پر اعتراض کے مترادف ہیں۔ ان تحریروں میں قبول کم، رد زیادہ ہے۔ مقامیت کم ہے، علمیت زیادہ ہے۔ اشرافیت کم ہے، عوامیت زیادہ ہے۔ خود فیض نے بھی دیباچہ میں کہا ہے:

'' ان میں سخن علماء سے نہیں، عام پڑھنے والوں سے ہے جو ادب کے بارے میں کچھ

جاننا چاہتے ہیں۔''

انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ'' بہت سی باتیں جو اس وقت نئی تھیں اب پامال نظر آ رہی ہیں، ۔ چنانچہ وہ اپنی تحریروں میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔لیکن وقت اور عمر نے وفا نہ کی اور یہ من وعن شائع ہوئے ،صرف اس لئے کہ ان کے نظریہ میں آخر تک تبدیلی نہ آئی تھی۔

فکشن کے ان مضامین میں آپ فیض کے ناپختہ فیصلوں سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کے شوقِ مطالعہ،علم کی پیاس اور نظام دنیا کو سمجھنے کی جو للک ہے،انسانی و عالمی اقدار وافکار میں جذب و پیوست ہونے کا جو فکری وفطری جذبہ ہے،اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہ کیا کم ہے کہ اردو کا ایک شاعر جس کی پرورش شاعرانہ وصوفیانہ ماحول میں ہوئی، داستان، ناول، سرشار، شرر، پریم چند جیسے بزرگوں کی تحریریں پڑھ رہا ہے۔اس دنیا کے پیچ وخم اور کیف وکم کو سمجھنے کی کوشش کرر ہا ہے۔اس کے موضوعات، کردار، اسلوب سب کے سب اس کی قرأت کا ہی نہیں اس کے تفکر کا حصہ بنتے ہیں۔عین ممکن ہے کہ ان کی کلاسیکی رومانیت، جدید ترین مقصدیت کو نیا روپ دینے میں اور اس کے نفس کو مہذب کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہو۔

احتشام حسین نے فیض پر ہی مضمون لکھتے ہوئے کہا تھا کہ فکر کی یہ ریاضت مشقِ سخن سے کم تہذیب نفس سے زیادہ پیدا ہوتی ہے اور فیض کے مہذب، منظم ،مرتب ہونے سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔اسی لیے کچھ لوگ انہیں صوفی مسلم اور کچھ انہیں اشترا کی مسلم کہتے ہیں۔

فیض کا ڈرامہ

''غالب اور زندگی کا فلسفہ''

فیض بنیادی طور پر شاعر تھے اور مقبول و ہر دل عزیز شاعر.........لیکن ترقی پسند مفکر اور دانشور ہونے کے ناتے انھوں نے وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھے خاص طور پر اس وقت جب وہ راول پنڈی سازش کیس میں جیل میں قید تھے۔اس زمانے کے لکھے ہوئے زیادہ تر مضامین ایک کتاب کی شکل میں بعنوان میزان ستمبر ۱۹۶۵ء میں لاہور اکاڈمی لاہور نے شائع کئے۔ویسے تو اس کتاب میں نظریہ اور مسائل سے متعلق مضامین زیادہ ہیں لیکن اس کے علاوہ متقدین اور معاصرین کے عنوان سے منفرد شاعروں اور نثر نگاروں بطور خاص ناول نگاروں پر بھی مضامین ہیں۔متقدمین کے عنوان کے تحت انھوں نے نظیر، حالی، غالب، سرشار، شرر، پریم چند پر مضامین لکھے۔ غالب سے متعلق لکھتے ہوئے جو انھوں نے عنوان قائم کیا وہ ہے ......''غالب اور زندگی کا فلسفہ'' اس عنوان سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک تنقیدی مضمون ہوگا لیکن یہ مضمون نہیں بلکہ ڈرامہ ہے اور ایک سنجیدہ ڈراما........سنجیدہ ان

معنوں میں کہ اس کی ابتدا میں غالب کی شاعرانہ و مفکرانہ شخصیت اور بصیرت زیرِ بحث آجاتی ہے۔ موقع محل، کرداروں کے تعارف کے بغیر ڈرامے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ احمد نام کا کردار راست طور پر عابد نام کے کردار سے یہ کہتا ہے:۔

''میں کہتا ہوں کہ غالب پہلے فلسفی تھا اور بعد میں
شاعر .... یہ کچھ میں نہیں بڑے بڑے نقاد کہتے
ہیں........''

جواب میں عابد کہتا ہے ۔

''اور میں کہتا ہوں کہ تمہاری کتابوں اور تمہارے
نقادوں کی ایسی تیسی آپ جیسے بوالہوس حسن پرستی کے
مدعی بن بیٹھیں تو ہماری تنقید کا جو بھی حشر ہو کم ہے۔''

دونوں کی گفتگو کا لہجہ اور جذبہ ظاہر کرتا ہے کہ دونوں نوجوان ہیں اور اپنی بات سے ایک دوسرے کو قائل کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی گفتگو کا آغاز ہوا تھا کہ ایک دستک کے ذریعہ ثریا نام کی خاتون داخل ہوتی ہیں جو نسبتاً بڑی اور سمجھدار معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں کی گرمیِ بحث کو دیکھ کر سمجھاتی ہیں ۔

''میں سمجھتی ہوں کہ بحث کا آغاز موضوع بحث
کے مطابق ہونا چاہیئے آپ غالب پر بحث کر رہے
ہیں تو شوق سے بحث جاری رکھیئے لیکن بحث ہمیشہ
دھیمے اور پُرسکون لہجے میں ہونی چاہیئے......''

ڈرامہ کی ابتدا میں ہی غالب .....غالبیات اور ماہرینِ غالبیات پر لطیف سا طنز ملتا ہے۔ وہ نقادانِ ادب جو گرجتے زیادہ ہیں برستے کم ہیں ان کے بارے میں طنز کے تخلیقی اشارے ملتے ہیں۔ ثریا کا خیال ہے کہ غالب کے یہاں اُداسی زیادہ ہے یہ اُداسی و غمگینی غیر معمولی ہے جو سکون کے ساتھ زیرِ بحث لانا چاہئے نہ کہ چیخ چلا کر ....لیکن عابد کا خیال ہے کہ اُداسی ایک کیفیت ہوتی ہے نظریہ نہیں.....جس پر ثریا بڑے

سلیقہ سے جواب دیتی ہے کہ......''شاعر کا نظریہ اس کی واردات سے الگ نہیں ہوتا۔''
عابد کا پھر سوال اُبھرتا ہے کہ اس طرح سے تو یہ ہوا کہ غالب قنوطی شاعر ٹھہرے جس کا
جواب ثریا بڑے اعتماد سے یوں دیتی ہے۔:

''قنوطیت ایک ذہنی عقیدہ ہے.........موہومیت
اس کا جوہر ہے۔اداس دل و دماغ کو صرف بیتی ہوئی
راحت کا غم ہی نہیں اس کے لوٹ آنے کی امید اور
آرزو بھی ہوتی ہے۔''

ان مکالموں میں فیض نے بہ زبان ثریا ترقی پسند خیالات کی رو سے منطقی
انداز میں غم اور اُداسی کی نازک اور بلیغ شرح کی ہے۔امید و نشاط، آرزو و تمنّا کے
تمام نرم و نازک پہلوؤں کا عکس جھلکنے لگتا ہے۔ایک اُداسی میر کی ہے کہ دل چراغِ
مفلس کی طرح شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے۔ایک اُداسی درد کی ہے جو فنا بقا کی
طرف لے جاتی ہے اور ایک اُداسی فانی کی ہے جو بہت تیزی سے لاش کی شکل اختیار
کر لیتی ہے لیکن غالب کی اُداسی کو ان سب کے ساتھ شامل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان
کے یہاں ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ مختلف رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔جس کو
فیض نے احمد کی زبان سے یوں کہلوایا ہے۔

''واقعی اب سوچتا ہوں تو غالب کے کلام میں
اس کے تین پہلو دکھائی دیتے ہیں ماضی کی شادابی اور
رنگینی کی یاد۔اس کے کھو جانے کا غم حال کی بے کیفی
اور ویرانی .... مستقبل میں سہانے دنوں کی امید اور
حسرت ......قنوطیت ایک مفرد چیز ہے اور یہ
واردات ایک سہ پہلو مرکب ....''

اس کے بعد اشعار ہیں جو بڑے ڈرامائی ڈھنگ سے پیش کئے گئے ہیں۔یہ
الگ بات ہے کہ اشعار کا انتخاب بہت اچھا نہیں ہے۔فیض نے اشعار کے حوالے سے

بھی ماضی ۔ حال اور مستقبل کو الگ الگ ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اوّل تو ڈرامے کی پیش کش میں یہ جذب نہیں ہوتے پھر فلسفیانہ گفتگو سے ان کا راست طور پر رشتہ استوار نہیں ہوتا۔ تاہم مکالمات میں جان ضرور دکھائی دیتی ہے۔

عابد ایک ایسا کردار ہے جو ثریا اور احمد کے مشترک خیالات میں اختلاف کی زمین تلاش کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ اس کا یہ کہنا........

"احمد فرماتے ہیں کہ غالب پہ ماضی کی محبت
غالب ہے۔ آپ فرماتی ہیں غالب کی نفرت سے
مغلوب ہے۔"

ثریا جو پڑھی لکھی ہے ذہین اور حاضر جواب ہے فوراً کہتی ہے ۔

"یہ ایک ہی واردات کے دو پہلو ہیں۔ ان میں کوئی ضد تو نہیں ہے۔"

باتوں باتوں میں گفتگو کا رُخ بدلتا ہے۔ غالب کی غم کے تئیں بے نیازی نئی نسل کو ایک عجیب سے فیشن میں بھی مبتلا کرتی ہے۔ جیسا کہ احمد کہتا ہے ۔

"آج کل کے کئی نوجوانوں کی طرح غالب نے
اپنے دکھ کو ایک نشانِ استغنا ایک لااُبالانہ انداز ٹالنے کی
کوشش کی ہے یا انقلاب کے دائمی عمل اور چناں نماند
وچنیں نیز ہم نے خواہد ماند کے فلسفہ میں قرار ڈھونڈھا۔"

اور پھر یہ اشعار ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

× × ×

یہی نہیں غالب کے یہاں تو موت کی خواہش ہے لیکن یہ خواہش جدید شعراء

کی خواہش مرگ یا قنوطیت سے بہت مختلف ہے۔اسی لیے غالب یہ بھی کہتا ہے ۔

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

× × ×

ان اشعار میں جلد ہی اجزائے پریشاں کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور غالب کی خواہش مرگ ایک ایسے فلسفے کا رُخ اختیار کر لیتی ہے جہاں سب کچھ مٹ جانے کی باوجود زندگی کی دائمیت قائم رہتی ہے۔یہی وہ مقامِ فکر ہے جہاں غالب دوسرے فلفی اور قنوطی شاعروں سے الگ ہوتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے بقول عابد ۔

''غالب کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اسے قبول کرنے کے لیے لوہے کا دل چاہیئے لیکن شاعروں کا دل عام طور سے بہت گھٹیا مار کے کا ہوتا ہے۔اس پہ جذبات کا ہم سے زیادہ دباؤ پڑتا ہے۔اسی لئے غالب نے اپنے دل سے یہی سمجھوتہ کیا کہ یہ سب کچھ جو میرے سامنے ہو رہا ہے خدا جانے ہو بھی رہا ہے کہ نہیں۔ ہم سب لوگ ایک بھیانک خواب دیکھ رہے ہیں۔''

حالانکہ یہ حقیقت تھی..........لیکن کبھی کبھی حقیقت اس قدر سفاک اور بے رحم روپ اختیار کر لیتی ہے کہ وہ ساکت نہ ہو کر خواب اور وہم وگمان کی شکل میں سیال ہو جاتی ہے اور نازک احساس شخص وشاعر متزلزل اور مرتعش خیالات سے دوچار ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔غالب ایک غزل میں یہ کہتے ہیں ۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

تو اسی غزل کے دوسرے شعر میں یہ بھی کہتے ہیں ۔

جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ایک کیفیت اور ہوتی ہے جس کو فیض نے بہ زبان احمد یوں کہلوایا ہے ۔

''ماضی سے متعلق غالب کا خیال موہوم نہیں
ہے لیکن جب بھی غالب اپنے حال کی کیفیات کا
بیان شروع کرتے ہیں ۔ ہر کیفیت میں ایک کے
بعد ایک دوری سی ایک دھندلاہٹ سی پیدا ہو
جاتی ہے۔ تصویر سامنے آتی ہے لیکن اس کے
نقوش ایک لامحدود پس منظر سے یوں گھلتے ملتے
چلے جاتے ہیں کہ تصویر اور اس کے پس منظر کو
ایک دوسرے سے جُدا کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔
خاص طور پر جب غالب خالص غنائی معاملات کا
ذکر کرتے ہیں یا محبت کے گوناگوں احساسات رقم
کرتے ہیں مثلاً یہ شعر ۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہٴ ہائے دور دراز

اندیشہٴ ہائے دور دراز کے ذریعہ فیض نے غالب کا فکری تنوع اور اس عہد کی کشاکش کو ایسے تخلیقی و بھاری انداز میں ہم آہنگ کیا ہے اور احمد کے مکالموں کے ذریعہ یہ کہلوایا ہے کہ غالب کے ایسے فکر انگیز اشعار میں کوئی بھی تصویر مکمل نہیں ہوتی اور یہ صرف غالب کی انفرادیت نہیں ہے بلکہ عہد غالب کی انتشاری و بحرانی کیفیت بھی ہے جس کو غالب نے پہلے تشکیک بعد میں تخلیق کے

انداز میں کچھ یوں جذب و پیوست کیا ہے جو قدم قدم پر غالب کے سوالیہ نوعیت کے اشعار میں اجاگر ہوتی ہے ۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کی ترے رُخ سے نگہہ کامیاب ہے

× × ×

فیض نے اس منطقی گفتگو کے ذریعہ ذات وحیات اور کشمکشِ حیات کو فکر و فلسفہ کی سطح پر مُدغم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور زندگی کے ارضی و حقیقی پہلوؤں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔عابد، احمد اور ثریا کی تین زاویوں سے ہونے والی معنی خیز گفتگو کے درمیان اچانک ایک اور دستک ہوتی ہے۔ثریا رخصت ہوتی ہے اور مرزا جی داخل ہوتے ہیں اور اس گفتگو میں شریک ہو جاتے ہیں۔احمد بتاتا ہے کہ ہم لوگ غالب کی اُداسی یا اُداس موہومیت پر گفتگو کر رہے ہیں جس پر مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اس طرح کی موہومیت تو اکثر غزل کے شعراء میں پائی جاتی ہے۔احمد پھر کہتا ہے کہ ۔

''چونکہ غالب نے اپنے تجربات کی واضح حد بندیاں نہیں کیں اس لئے ہمارے جذبات کی حدیں ان میں جذب ہوکر رہ جاتی ہیں۔''

اس پر مرزا صاحب اپنی بزرگی اور تجربے سے بھری بات یوں کہتے ہیں ۔

''ہر ایک کی اپنی مخصوص اچھائی ہوتی ہے ۔
غالب کی مخصوص اچھائی یہ ہے کہ وہ ایک فرد نہیں

ایک نسل ہے وہ چند لمحوں کا ترجمان نہیں بلکہ ایک
پورے دور کا نمائندہ ہے ....غالب ایک ایسے
دور کا ترجمان ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ ایک ایسی
نسل کا نغمہ جو دفنائی نہیں گئی۔''

عابد کو ان باتوں سے دلچسپی نہ تھی وہ تو صرف اُداسی ۔ ذہنی کیفیت پر ہی ٹکا رہنا چاہتا تھا چنانچہ اس کے رُخ کو دیکھ کر اور مرزا کی طولانی گفتگو سے اب کرا چانک بات کا رُخ موڑ دیتا ہے اور احمد سے کہتا ہے کہ کچھ سناؤ.......اور شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن یہاں بھی غالب کے ہی اشعار پڑھے اور سُنے جاتے ہیں۔

''عظمتوں کے انیک رنگ ہوتے ہیں۔ غالب جیسے عظیم شاعر کو ہر زاویہ اور ہر پیمانہ سے جانچا پرکھا گیا ہے۔ ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں لیکن ڈرامے کی صنفی ضرورت اور حقیقت کے پیش نظر زیادہ تر ڈرامے غالب کی حیات، شخصیت، عشق بازی، شراب نوشی یا اسی نوع کی واردات کو ہی مرکز میں رکھا گیا ہے شاعری کے سنجیدہ و فکری پہلو پر بڑے نام ہی آسکے ہیں۔ اکثر ڈراموں میں غالب خود ہی موجود بھی پوری سرمستیوں و خرمستیوں کے ساتھ، احباب کے ساتھ، اس اعتبار سے یہ پہلا ڈراما ہے جس میں غالب غیر موجود ہیں اور نئی نسل کے دو تین لوگ ان کی شخصیت حسن وعشق کے بارے میں کم ان کی سنجیدہ و فلسفیانہ شاعری کے بارے میں ہی بات کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر دلچسپ اور گھریلو قسم کے مکالموں کے ذریعہ ماحول میں دلچسپی و بے تکلفی لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے تاکہ گاڑھا پن نہ آنے پائے نیز ڈرامے کا ماحول بنے اور فکری پہلوؤں کو تفہیم کی منزل پر بھی لے جائے مثلاً ....'' کانوں کا میل نکلواؤ۔ ان پھٹے پھٹے دیدوں کے بجائے کانوں پر چشمے چڑھواؤ۔''

''اے ہے یہ کیا دنگا ہو رہا ہے۔ لڑنے کو یہی ایک کمرہ رہ گیا ہے۔''

''تمھارے بھائی جان آجائیں۔ نہ پٹواؤں تو سہی۔''

غالب پر سنجیدہ گفتگو بظاہر ایسی ہی شکل اختیار کر لیتی ہے خصوصاً اس وقت جب

دو متضاد فکر کے دانشور باہم تبادلۂ خیال کر رہے ہوں اور اپنی اپنی بات پر اڑے ہوں۔
ایک مقام پر جب احمد، ثریا کی کسی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے:

''یہ تو خوب بات نکالی ثریا باجی... واقعی اب سوچتا ہوں تو غالب کے کلام میں اس کے تین پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ ماضی کی شادابی اور رنگینی کی یاد، اس کے کھو جانے کا غم، حال کی بے کیفی اور ویرانی مستقبل میں سہانے دنوں کی امید اور حسرت، قنوطیت ایک منفرد چیز ہے اور یہ واردات ایک سہ پہلو مرکب''

تو بات کاٹ کر اور تڑپ کر عابد کہتا ہے:

''سبحان اللہ کیا سہ شاخہ نکالا ہے۔ فلسفہ پر بحث کرتے کرتے اب مکاری پر اُتر آئے۔ یہ منفرد ہے۔ وہ مرکب ہے وہ مضمون ہے وہ مُر بہ ہے۔ بھئی بحث کرنا ہے تو ہم سند کے بغیر کچھ سننے کو تیار نہیں۔''

ان جملوں میں فیض نے غالب سے متعلق ہی نہیں [illegible] شاعری بلکہ پورے ادب کے بارے میں اپنے عہد اور گرد و پیش میں ہونے والی نہ [illegible]رف بحثوں بلکہ لب و لہجہ کو بھی پیش کر کے پورے دور کی تنقیدی و تفکیری تہذیب کو پیش کیا ہے۔ اس زمانہ میں ترقی پسندی اور جدیدیت کا رجحان عام تھا۔ حسن عسکری اور دوسرے جدید ادیب اسلامی ادب کے ذریعہ قنوطی رجویت کو تلاش میں سرگرداں تھے۔ ترقی پسند اپنے ڈھنگ سے تعبیریں کرتے تھے۔ خیالات متلاطم و متصادم تھے اس لئے یہ ڈراما بھی تضاد و تصادم سے ہی شروع ہوتا ہے۔ لیکن ثریا اور مرزا جو نسبتاً بزرگ اور سمجھدار ہیں ان کی متوازن اور منطقی گفتگو سے قائل اور معقول کی سطحیں اُبھرتی ہیں۔ غرضکہ بعض چھوٹے چھوٹے معمولی اور دلچسپ جملوں سے قطع نظر پورا ڈراما غالب [illegible] عہد غالب اور فلسفہ غالب کے ارد گرد رہتا ہے اور فیض نے ان مسائل کو بھ[illegible] وہ ڈرامائی

ڈھنگ سے نہ سہی لیکن سادگی اور لطافت کے ساتھ کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ جس میں ترسیل، تشکیل اور تخلیق کی پوری کیفیت سما گئی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا۔ ڈراما کی جان نقل و حرکت ہوتی ہے۔ مکالمے اس کے بعد لیکن اس ڈرامے میں سب کچھ مکالمے ہی مکالمے ہیں۔ سارا زور مکالمات اور خیالات پر ہی ہے۔ کوئی چاہے تو ساز وسامان اور دیگر لوازمات سے محروم اس ڈرامے کو محض ایک گفتگو بھی کہہ سکتا ہے لیکن یہ گفتگو بھی بہر حال ڈرامائی حدوں کو چھوتی ہے اور غالب کی شاعری ہی نہیں۔ غالب کے فلسفہ اور اس کے زمانے کو بڑے لطیف اور معنی خیز انداز میں پیش کرتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ فیض کا یہ ڈراما غالب پر پہلے اور بعد کے لکھے گئے ڈراموں سے قطعی مختلف ہے جو بہت سارے فکری تنقیدی اور بوجھل مضامین و مقالات کو بہت پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

فیض ـــــ ایک روسی اسکالر کی نظر میں

ڈاکٹر ژدمیلا وسیلیوا روسی اسکالر ہیں لیکن اردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں اور اب انھیں ایسی مہارت حاصل ہے کہ صاحبِ زبان کی طرح اردو بولتی اور لکھتی ہیں۔ برسوں وہ ماسکو یونیورسٹی میں بطور لیکچرار درس و تدریس میں مصروف رہیں۔اس کے علاوہ ماسکو ریڈیو پر اردو سروس پر رہیں اور اب وہ ماسکو کے ادارۂ شرقیات میں سینئر ریسرچ اسوسی ایٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔ انھوں نے روسی زبان میں اردو ادب پر مضامین لکھے اور ترجمے کئے ہیں۔فسانۂ عجائب سے لے کر جدید فکشن کے متعدد ترجمے روسی زبان میں کئے۔اردو میں بھی لکھے اور ناقدانہ انداز کے لکھے جو بیحد مقبول ہوئے۔ان کی اس غیر معمولی خدمات کے لئے پاکستانی حکومت نے انھیں ''ستارۂ امتیاز'' کا اعزاز بھی دیا۔

ادارۂ شرقیات کے لئے ایک منصوبے کے تحت انھوں نے روسی زبان میں فیض پر بھی کام کیا (2002)۔ روسی زبان میں فیض بے حد مقبول شاعر ہیں۔ بقول

جمیل جالبی ـــــ ''سویت روس میں فیض کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۳ء میں فیض کی پچاس نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ ایک لاکھ کی تعداد میں شائع ہوا اور انتخاب کلام فیض ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۵ء میں دس دس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ لُومیلا نے بتایا کہ کل ملا کر صرف روسی زبان میں کلام فیض کی تعداد اشاعت دو لاکھ دس ہزار کاپیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ سویت روس میں یہ شہرت وعزت اور یہ مقبولیت شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے حصّے میں آئی ہو.....''
کتاب کے معیاری اور عمدہ ہونے کے باعث اسے اردو میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ اثامہ فاروقی نے کیا اور کچھ قسطیں سب رس حیدرآباد میں شائع بھی ہوئیں لیکن اثامہ فاروقی پوری کتاب کا ترجمہ کئے بغیر ہی انتقال کر گئے۔ پھر اس کا اردو ترجمہ خود لُدمیلا نے کیا ـــــ جسے ۲۰۰۷ء میں آکسفرڈ پریس کراچی نے ''فیض حیات و تخلیقات'' کے عنوان سے شائع کیا۔

فیض پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس کتاب کا مطالعہ وتجزیہ اس لئے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ اسے ایک روسی اسکالر نے لکھا ہے اور روسی زبان میں لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا اپروچ، نظریہ اردو کے پروفیشنل ادیبوں ونقادوں سے مختلف تو ہوگا۔ بقول جمیل جالبی ـــــ ''اس میں بہت سی باتیں [illegible] گئی ہیں جو اردو قارئین کے لئے نئی ہیں ـــــ''

لُدمیلا نے ابتداء میں لکھا ہے:۔

''روس میں مرزا غالب، الطاف حسین حالی اور
علامہ اقبال پر گہرا تحقیقی کام ہوا ہے یوں منطقی طور پر
اپنے دور کے نمائندہ اردو شاعر فیض کی تخلیقات اب
محققین کی توجہ کا مرکز بنی۔''

غالب، حالی وغیرہ کے مقابلے میں روس میں فیض کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فیض روس گئے ہیں۔ کافی مُدت رہے ہیں۔ وہاں کے اشتراکی نظام سے

متاثر رہے ہیں اور فیض نے خود اعتراف کیا ہے کہ جو کیفیتیں ان پر یہاں گذرتی ہیں وہ ان کی شاعری میں منعکس ہوتی ہیں۔ اس لئے لاشعوری طور پر روس کے قارئین ان کی تلاش بھی کرتے ہیں اور انھیں اوروں کے مقابلے اپنے سے قریب بھی سمجھتے ہیں۔ ان نزاکتوں اور زاویوں کے پیش نظر فیض کی اشتراکی اور انقلابی شاعری کے پیشِ نظر بھی باقاعدہ سرکاری ادارے نے لُدمیلا سے یہ علمی کام کروایا جس کا سب سے منفرد دو مختلف حصّہ وہ ہے جہاں شاعری کو اور بالخصوص زندانی شاعری کو ایک روسی قاری کے زاویہ سے فیض کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ نازک پہلو اُجاگر کیا گیا ہے کہ ان کے زندانی کلام کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ نظم غزل کی طرف اور غزل نظم کی طرف بڑھی ہے۔ لُدمیلا کا اصل کام تو حالی پر ہے اور بہت اچھا کام ہے لیکن فیض پر کام کی ایک سہولت یوں بھی میسّر آئی کہ وہ خود فیض کے بہت قریب تھیں۔ کتاب کی ابتدا میں فیض کے ساتھ ان کی تصویر ہے اور یہ تحریر بھی۔

لُدمیلا کے لئے ___ غم جہاں ہو رُخِ یار کہ دستِ عدو/ سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا۔

اس کے علاوہ وہ ابتدا میں ایک جگہ لکھتی ہیں۔

''میں اپنے کو اس لحاظ سے بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ مجھے ایک طویل عرصے کے دوران فیض صاحب سے ملتے رہنے۔ ان کی ذات سے فیضیاب ہونے اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ فیض صاحب کی مترجم کی حیثیت سے میں نے ان کی ہمراہی میں سابق سوویت یونین کے متعدد سفر بھی کیئے تھے۔ ان کے ساتھ گذارے ہوئے دنوں کی ناقابلِ فراموش یادیں یہ کتاب لکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی ہیں___''

اس کتاب کی خصوصیت اورانفرادیت کا ایک نکتہ اور ہے جو دلچسپ اور معنی خیز ہے اسے بھی لُد میلا کی زبانی سنئے :۔

''اپنی کتاب میں میں نے کچھ ایسی باتوں کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ایسے شعری عناصر کی شرح کی ہے جو اہلِ زبان کو غیر ضروری معلوم ہو سکتی ہے لیکن یاد رہے کہ ایک عام روسی قاری بنیادی طور پر نہ پاکستان کے ماحول سے اور نہ ہی اردو شاعری کی خصوصیات سے آگاہ ہے اس لیے اس کو بہت کچھ تفصیل سے بتانا پڑتا ہے۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ روسی پڑھنے والے دلفریب شخصیت کے مالک اور ''شعر کے جادوگر'' فیض اور ان کے ملک کے ثقافتی ماحول سے بہتر طور پر متعارف ہو جاتے اور ان کے کلام کی مدد سے اردو شاعری کے طلسم سے آگاہ ہوسکیں۔''

اب میں کتاب کے اصل متن پر باتیں کروں گا____

۲۹۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب چودہ ابواب میں تقسیم ہے جس کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے:۔

'' فیض احمد فیض کے ہم عصر وطن شاعروں ادیبوں میں جیسا کہ بعض نقادوں نے انھیں نام دیا ہے ان جیسا ''قسمت کا دھنی'' نہیں ملے گا ممکن ہے کہ ان کا خیال ایک حد تک صحیح ہو گویا کہ فیض سب سے پہلے ایک حد درجہ محنتی آدمی تھے____ فیض اپنے بہتیرے خاصے باصلاحیت پیش رووں کے مقابلے میں واقعی کہیں زیادہ خوش قسمت ثابت ہوئے۔ فیض کو لوگ نہ صرف ہمیشہ

توجہ سے سنتے تھے بلکہ وہ ان کو چاہتے تھے ان کا احترام
کرتے تھے اور زندگی میں ہی انھیں اردو کے مستند شاعر
اور کلاسیک کا رتبہ حاصل ہو گیا____ " (ص ۔۱)
اس کے بعد یہ بھی خوبصورت تخلیقی جملے........

"پھر بھی ان کے اوپر آسمان بادلوں سے صاف
نہیں رہا۔ ان کے سر پر بھی بارہا بادل گرجے اور
بجلیاں چمکیں ۔ ان کی زندگی میں بھی بدخواہی کے
طوفان آئے ۔تنقید کے جھکڑ چلے اور کہیں تو ان کی جان
کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا لیکن ان سب آزمائشوں کا نتیجہ
یہ نکلا کہ شاعر کی قوت ارادی میں اور پختگی آئی اور اس
کی شہرت کا سونا اور بھی زیادہ چمک اُٹھا۔ قسمت خود
فیض پر ایسے ہی مہربان تھی جیسے کسی زمانے میں ان کے
والد پر____ " (ص ۲۔۱)

اس باب میں فیض کے والد سلطان محمد خاں اور ان کے بڑے بھائی طفیل
کے حوالے سے خاندان، گاؤں، دیہات، زمین جائداد کا ذکر زیادہ ملتا ہے کہ والد
کے انتقال کے بعد کس طرح فیض کے بڑے بھائی زمین جائداد کا مقدمہ لڑتے رہے
اور قرض ادا کرتے رہے المیہ یہ ہے کہ طفیل مقدمہ جیتنے کے باوجود زمینوں پر قبضہ نہ
لے سکے اور ۱۹۵۲ء میں جبکہ فیض جیل میں تھے اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے
ان کا انتقال ہو گیا۔ فیض نے جو اپنے بڑے بھائی سے بیحد محبت کرتے تھے ان کے
انتقال پر بیحد دُکھی ہوئے اور بھائی کی موت پر ایک دلدوز مرثیہ بھی کہا۔ بڑے بھائی
کے انتقال کے بعد فیض نے جائداد کی کچھ کچھ چیزیں تو اپنے پاس رکھیں بقیہ سب ان
رشتہ داروں کے نام کر دیا جن کا غیر قانونی قبضہ تھا۔ فیض کے صلح مزاج کے فیصلے سے
ان کی والدہ بہت خوش ہوئیں اور ماتھا چوم کر کہا____ "فیض اس قسم کے فیصلے تم نے

پہلے کیوں نہ لئے اور یہ فیصلے تمھارے ذہن میں کہاں سے آئے ہیں۔''

اگلے باب کا تعلق فیض کے لڑکپن سے ہے جس کی فیض کی ابتدا صحیح سنِ ولادت سے ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ خود فیض نے بسیار تلاش و تحقیق کے بعد ایک جگہ لکھا ہے کہ ـــــ

''تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷/ جنوری ۱۹۱۱ اور کہیں ۷/ جنوری ۱۹۱۲ء درج ہے۔ میں نے حال میں ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات کا ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳/ فروری ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے۔'' (ص ۱۲)

لیکن لُدمیلا اس سے مطمئن نہیں لکھتی ہیں ـــــ

''اس کے باوجود اپنی اس رائے کے اظہار سے خود کو روکنا مشکل ہے۔ اگر اسکول کے کاغذات میں ۷/ جنوری کی تکرار پر غور کریں تو شاعر کی پیدائش کی تاریخوں میں اختلاف کی وجہ کے بارے میں ایک قیاس کی طرف خود بخود خیال جاتا ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ فیض کی والدہ ایک زمیندار کی بیٹی تھیں۔ ان کا بچپن اور جوانی دیہات میں گذری تھی۔ شادی کے بعد سلطان فاطمہ شہر میں رہیں لیکن یہاں انھوں نے ہمیشہ خود کو بے آرام محسوس کیا۔ وہ گاؤں کے اپنے رشتہ داروں کے ہاں سیر سفر کے ہر موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں رہتی تھیں۔''

اور آگے لکھتی ہیں ۔

''بعد میں بچے اسکول میں داخلے کے وقت
اسکول کے دفتر میں تاریخ پیدائش رشتے داروں نے
جو لکھائی لکھ لی گئی جو اس روایت سے جسے ہمارے نقطۂ
نظر سے صحیح سمجھنا چاہئے یعنی ۷/ جنوری سے بالکل
مطابقت رکھتی ہے۔'' (ص ۱۳)

اس کے بعد وہ چند سطروں میں اپنا قیاس ظاہر کرتی ہیں تاہم چند روز کے آگے پیچھے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا لیکن تحقیق تو بہرحال تحقیق ہے۔

فیض کا اصل کام فیض احمد خاں تھا۔ خاں بہرحال خاندانی نام تھا لیکن فیض کا نرم مزاج ابتدا سے ہی خان کو حذف کر دیا کرتا تھا اور بقول لُدمیلا ____ ''عام طور پر اپنا نام فیض احمد فیض بتاتے۔''

اپنے نکاح نامہ میں بھی انھوں نے فیض احمد فیض لکھا۔ گھر کا مذہبی ماحول، آیاتِ قرآنی سے بچپن کی ابتداء اور اسلامی اسکول یعنی مکتب میں داخلہ جس کے سربراہ اسی علاقہ کے مشہور عالم مذہبی کارکن مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی تھے۔ جو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی زبانیں بھی پڑھاتے تھے۔ لُدمیلا لکھتی ہیں:۔

''اس اسکول میں پانچ سال تک سورہ ہائے
قرآن حفظ کرتے رہے اور ان کی صحیح قرآت سیکھتے
رہے اور تفسیر قرآن سے واقفیت حاصل کی اور اس کے
علاوہ فارسی اور عربی زبان بھی سیکھتے رہے۔''

یہ تو تھی ان کی ابتدائی تعلیمی صورت، اب مزاجی کیفیت کے بارے میں وہ دلچسپ لیکن سچے جملے لکھتی ہیں۔

''فیض کم سنی ہی سے سب کا مرکز توجہ ڈرپوک پن
کی حدوں کو چھوتا ہوا ان کا انتہائی شرمیلا پن تھا۔ ان

کے مزاج کی حیرت انگیز جھگڑوں سے بچنے کی اور ہر
آویزش کو سبھی دستیاب ذرائع سے رفع دفع کرنے کی
ان کی تمنا تھی۔''

ہوسکتا ہے کہ فیض فطرتاً ایسے واقع ہوئے ہوں لیکن خود فیض ایک جگہ اپنی اس طبیعت کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

''بچپن کا میں سوچتا ہوں تو ایک خاص یاد آتی
ہے کہ ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا۔ ہم تین
بھائی تھے۔ان میں ہمارے چھوٹے بھائی (عنایت)
اور بڑے بھائی (طفیل) خواتین سے باغی ہوکر کھیل
کود میں مصروف رہتے۔ ہم اکیلے ان خواتین کے
ہاتھ آگئے۔ اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ
بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی
شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے کوئی
غیر مہذب یا اُجڈ قسم کی بات اس زمانے میں ہمارے
منہ سے نہیں نکلتی تھی اب بھی نہیں نکلتی ۔نقصان یہ ہوا کہ
جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے کہ بچپن میں کھلنڈرے
پن یا ایک طرح کی لہو ولعب کی زندگی گذارنے سے ہم
محروم رہے۔''

اس پر ماں کی تربیت ،شفقت ،مہربانی ،ملنساری ، دیانت داری ان سب کا اثر فیض نے لیا لیکن لُدمیلا فیض پر صرف ماں کے اثرات نہیں بلکہ باپ کے اثرات کے تذکرے کچھ یوں کرتی ہیں ۔

''باپ بھی منجھلے بیٹے کو کچھ کم وقت نہیں دیتے
تھے۔شاید بڑے بیٹے سے زیادہ دیتے رہے ہوں اور

فیض پر ان کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔ سلطان محمد بچے
کی دلچسپیوں پر بہت توجہ دیتے۔ انھیں گہرائی سے سمجھنے
کی کوشش کرتے اور سنجیدہ کاموں کے تعلق سے ان کی
قدرتی صلاحیتوں کو نشو و نما دینے میں ہر طرح سے مدد
کرتے وہ بیٹے سے اکثر اور بہت دیر تک باتیں
کرتے۔ اس کی کامیابیوں پر نظر رکھتے۔ وہ بیٹے کے
لیے اساتذہ اور کالجوں کا انتخاب خود کرتے۔''

اس کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتی ہیں ۔

''صحیح ترین ادعا یہ ہوگا کہ بیٹے نے ورثے میں
ماں کی نیک مزاجی پائی اور باپ کی شاندار صلاحیتیں
ان میں بلاشبہہ ایک حد تک باپ کی قسمت کے دھنی
ہونے کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔''

لُدمیلا نے عمر کی اس منزل پر فیض کے ایک شوق کو تلاش کیا ہے اور وہ ہے
فیض کی ڈراموں سے دلچسپی، لکھتی ہیں ۔

''اسکول کے زمانے سے وہ ناٹک دیکھنے کے
بے حد شوقین تھے۔ لاہور اور دہلی سے یہاں تک کہ
دور دراز بمبئی سے بھی ناٹک منڈلیاں اکثر سیالکوٹ
آتی رہتی تھیں۔ اس زمانے میں آغا حشر کاشمیری کے
ڈراموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ جب بھی یہ
اسٹیج پر کھیلے جاتے تماش بینوں کی بڑی تعداد اکٹھا
ہوتی۔ فیض اپنے اسکول کے دوستوں کے ساتھ رات
دیر گئے تک انھیں تماشوں میں غائب رہتے۔ تھیٹر سے
لڑکپن کے دنوں کی دلچسپی بعد میں ڈراما نگاری کے بے

حدِ شوق میں تبدیل ہوئی۔''

ایک جگہ خود فیض لکھتے ہیں ۔

''میں اسٹیج پر جو کچھ دیکھتا اس سے ایک عرصہ تک
متاثر رہتا۔ خود کو ہیرو تصور کرتے ہوئے تناؤ سے بھرپور
ڈرامائی واقعات کو ازسرِ نو شدت سے کرتا۔ آغا حشر کا
ہیرو بہادر ٹس سے مس نہ ہونے والا اور اپنے عقائد کی
خاطر جان پر کھیل جانے والا شخص ہوتا۔''

فیض اس وقت تک اپنے مدرسے نکل کر اسکاچ مشن اسکول پہنچ چکے تھے اور امتیازی نمبروں سے درجات پاس کررہے تھے۔ یہ وہی اسکول ہے جہاں سے علامہ اقبال نے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اور اسکول میں اب بھی بعض اساتذہ ایسے تھے جنھوں نے اقبال کو پڑھایا تھا۔ اس کے بعد وہ مرے کالج پہنچے۔ یہاں ان کو انگریزی ناول پڑھنے کی عادت پڑی۔ عربی، فارسی، پنجابی، انگریزی، ڈراما، ناول، مذہب سب نے مل کر فیض کو کم عمری میں ہی سنجیدہ اور بُردبار بنا دیا۔

بقول مصنفہ :۔

''فیض میں بچپن ہی سے ذہنی تجسس اور پڑھائی
لکھائی کا شوق پیدا ہوا، تعلیم کے تعلق سے ان کا رویّہ
سنجیدہ ہوگیا اور اس سے ان کی فطری صلاحیتوں کو
پروان چڑھنے کی تحریک ملی۔''

اس کے علاوہ والد کا شاعرانہ ذوق، سیالکوٹ کا شاعرانہ ماحول، اسکول میں احباب کی صحبت، شعروشاعری، بیت بازی، جس سے فیض کم عمری میں روشناس ہوئے اور ایک خیال ہے کہ محض تیرہ سال کی عمر میں چند اشعار موزوں کئے۔ کچھ ٹھٹھول کئے لیکن باقاعدہ ابتدا تو اس وقت ہوئی جب ان کا محلّے کی ایک لائبریری سے سابقہ پڑا۔ ابتداً ناول پڑھے اور اس کے بعد ـــــــ بقول لُدمیلا ۔

''پہلے تو انھوں نے اردو نثر میں بہت دلچسپی ، سرشار، شرر کی تقریباً سبھی تصنیفات پڑھ ڈالیں پھر اردو شعراء کے دیوان ان کی توجہ کا مرکز بنے اور وہ جہانِ شاعری میں ہمیشہ کے لئے کھو گئے ۔''

خود فیض لکھتے ہیں ۔

''غالب تو اس وقت بہت زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسروں کا کلام بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا نہیں آتا تھا لیکن ان کے دل پر اثر کچھ عجیب قسم کا ہوتا تھا۔ یوں شعر سے لگاؤ پیدا ہوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔ اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جیسے یکا یک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں اور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا اس کی صورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کے قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔''

بس اس موڑ پر شوق وشعور کی اس منزل پر فیض جہاں ایک طرف انگریزی ناول پڑھ رہے تھے دوسری طرف اردو کی کلاسیکی شاعری میں ڈوب رہے تھے۔ کلاسیکی شاعری کا صوفیانہ رنگ اور عاشقانہ جذبہ سب کہ سب ان کے مزاج ذوق اور ان کی فارسی دانی کو موافق آرہا تھا۔

شعر و شاعری کا ذوق اور مشاعروں کا کلچرلڈ میلا کے لئے حیران کن تھا اسی لیے وہ اس مزاج و مذاق کے بارے میں دلچسپ انداز میں لکھتی ہیں ۔

''مشاعرے شمالی ہند کے سبھی شہروں میں فُرصت کے تہذیب مشاغل میں بنیادی حیثیت رکھتے

تھے۔ ان شہروں کے باشندوں کی اکثریت کے لیے
شان دار ادبی اور شعری روایت کی حامل زبان اردو
مادری زبان نہ بھی ہو تو ایک خصوصی حیثیت رکھتی تھی۔
وہ سبھی کے لیے بات چیت اور رابطے کی زبان تھی اور
ہر شہر کی گلیوں اور بازاروں میں سنائی دیتی تھی۔ اس
زبان میں اشعار گائے اور موزوں کیے جاتے تھے
____ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ مشاعرے کی
زبان تھی ایسا لگتا تھا کہ ہندوستان کے شہروں کے سبھی
باشندے شاعری کے پُر جوش عشق میں مبتلا ہیں۔
صدیوں کے دوران معرضِ وجود میں آنے والی
روایت کے مطابق شعراء کا کلام سُنتے اور اپنے اشعار
سنانے کے لیے اکٹھا ہوتے ___ ممکن ہو تو
مشاعرے میں اپنی غزل سُنائیں ____''

اور بھی باتیں ہیں اور اطلاعیں' ظاہر ہے کہ وہ روس کے قارئین وشائقین کو تہذیبی اطلاعات فراہم کررہی ہیں۔ سیالکوٹ کے انھیں مشاعروں میں فیض نے پہلے دوسروں کی غزلیں پڑھیں پھر ان کے اندر خود یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ہم خود اپنے شعر پڑھیں چنانچہ ایک جگہ خود فیض لکھتے ہیں ____ ''جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہم نے بھی تک بندی شروع کردی اور ایک دو مشاعروں میں شعر پڑھ دیے۔''

لُدمیلا کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ پہلی بار فیض نے اپنی غزل پڑھی تو ان کی عمر محض سولہ برس کی تھی اور یہ بھی کہ پڑھنے کو تو پڑھ دیا لیکن پذیرائی تسلی بخش نہیں رہی۔ ناظم مشاعرہ منشی سراج الدین نے یہ مشورہ دیا کہ وہ اس قسم کے تجربے کو آگے نہ جاری رکھیں اور پڑھائی لکھائی پر توجہ دیں اور فیض نے فی الوقت شعر کہنا ترک کردیا لیکن یہ مُدتِ ترک زیادہ نہ رہی اور مرے کالج میں داخلے کے بعد وہ یوسف سلیم چشتی کی

صحبت میں آئے۔ چشتی صاحب نشستیں کیا کرتے تھے فیض سے بھی ایک طرح پر غزل لانے کو کہا فیض نے جو غزل کہی وہ عمدہ ثابت ہوئی۔ چشتی نے کہا ___ ''فوراً اس طرف توجہ کرو شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ ___ '' اور فیض جو اس وقت غزلیں کہتے تھے مزید کہنا شروع کیا لیکن لُدمیلا کا خیال ہے کہ ___ ''غزلیں مبتدیانہ اور تقلیدی تو تھیں لیکن فیض کے ان بالکل ابتدائی اشعار میں بھی خالق کی غیر معمولی صلاحیت جھلکتی تھی'' ___ ۱۹۲۸ء کا ایک واقعہ ملاحظہ کیجئے ۔

'' ۱۹۲۸ء میں مرے کالج کے حلقۂ ادب کی طرف سے کالج میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا' جس میں شہرت یافتہ مدعو شعراء اور مبتدی شعرا دونوں ہی نے اپنی اپنی تخلیقات سامعین کے فیصلے کے لیے پیش کیں۔ سیالکوٹ کے کالج کے طلباء کی زندگی کے حوالے سے بھی یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس مشاعرے میں سترہ سالہ فیض احمد سب کے سامنے غزل سرا ہوئے اور ان کے کلام کو مقبولیت نصیب ہوئی۔ یہ فیض کی پہلی دھوم دھڑکے والی کامیابی تھی جس کی بدولت فطرتاً اس سیدھے سادے اور شرمیلے نوجوان میں شعر گوئی کو سنجیدگی سے اختیار کرنے کا عزم پیدا ہوا۔'' ہر چند کہ ان ابتدائی دنوں کی شاعری کو فیض محض مشقِ سخن یا قافیہ پیمائی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں پڑھی گئی فیض کی پوری غزل تو نہیں ملتی لیکن لُدمیلا نے ایک شعر کہیں سے حاصل کر لیا۔ ان کا خیال ہے کہ اس شعر کو سامعین نے اس قدر پسند کیا کہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔ وہ شعر ہے ۔

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

لُدمیلا نے اس شعر کی توصیف و توضیح بھی خوب کی ہے جس سے روایتی اور کلاسیکی اردو شعریات سے لُدمیلا کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک شعر کی تشریح دو صفات میں ہوتی ہے اور یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

''اس چھوٹی سی مثال کی بنا پر یہ تسلیم کیا جا سکتا

ہے کہ نوجوان فیض کو شعر گوئی کے پیچیدہ فن پر پوری
قدرت حاصل تھی۔ کلاسیکی شاعری کے اصول انھوں
نے پروفیسر چشتی اور مولانا میر حسن سے سیکھے اور
مشاعروں میں جن میں برسوں انھوں نے اپنے والد
کے ساتھ حاضری دی ان کے کان شعر سے آہنگ
ہوتے رہے۔''

یہ خالص نوجوانی کا درد تھا۔ راہ مشکل تھی، منزل صاف نہ تھی جس کو فیض نے غزل کے ایک شعر میں اس طرح ظاہر کیا۔

نہ پوچھ عہدِ الفت کے بس ایک خواب پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لائے نہ دل کا مدعا سمجھے

اس کے بعد فیض علامہ اقبال کا سفارشی خط لے کر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ جسے کالج کے پرنسپل قاضی فضل الحق نے اپنے قبضہ میں رکھ لیا ورنہ وہ خط کام کا ہوتا۔ فیض اب اُس کالج کے طالب علم تھے جہاں اقبال بھی رہ چکے تھے۔ یہیں پر فیض کا ساتھ پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) سے ہوا جو کالج میں انگریزی کے پروفیسر تھے اور نہایت وسیع النظر اور روشن خیال انسان تھے۔ اسی کالج میں فیض کی ملاقاتیں کئی دیگر اہم ذی علم اور روشن خیال اساتذہ سے ہوئیں جن میں ایک غلام مصطفٰے تبسم بھی تھے۔ اسی کالج میں ۱۹۳۱ کے سالانہ مشاعرے میں ایک بار اقبال بطور مہمانِ خصوصی مدعو تھے۔ سب سے کہا گیا کہ اقبال پر نظم کہیں۔ فیض نے بھی نظم کہی۔ فیض کی یہ وہ نظم ہے جو اقبال کی زندگی بلکہ موجودگی میں کہی گئی اور باقاعدہ مشاعرے میں پڑھی گئی جسے بیحد داد وتعریف ملی جو بعد میں راوی میں شائع بھی ہوئی۔ اب یہ نظم نایاب ہے لہٰذا ملاحظہ ہو۔ مطابق....

''محوّلہ بالا نظم اقبال فیض کے نہایت قریبی
دوست اور ہم خیال پاکستانی ادیب صحافی سبط

حسن کے پرانے ادبی کاغذات میں محفوظ رہ
گئی۔انھوں نے ۱۹۶۵ء میں نظم کو نسخہ افکار کے
فیض نمبر کے لیے بھیجا۔اس نظم میں مبتدی شاعر
نے شاعری پر غیر معمولی قدرت کا مظاہرہ کیا ہے
اور اقبال کے مشہور معروف موضوعات (راز
ہائے نبود و بود قطرہ و دریا ذرہ اور ستارہ) کو اپنی
نظم میں نہایت سلیقے سے استعمال کیا ہے۔
فیض کے اپنے احساسات اور دلچسپیوں سے
ہم آہنگ تھا اور انھوں نے اشعار میں اپنے ذاتی
تاثرات کا اظہار کیا اور اقبال کی پُر خلوص تحسین و
توصیف کی....''

اس کے بعد لُد میلا نے اقبال اور فیض کے رشتے پر بیحد کار آمد باتیں کی ہی مثلاً.....

''اپنی ساری زندگی کے دوران فیض اقبال کی
تخلیقات کی طرف رجوع کرتے رہیں گے اُن میں
نئے پہلو دریافت کرتے رہیں گے۔ان کی شاعری
کے موضوعات کو آگے بڑھاتے رہیں گے اہم
فلسفیانہ اور ادبی و فنی مسائل کے بارے میں اپنے
نقطۂ نظر کا اقبال کے خیالات سے موازنہ کرتے
رہیں گے اور اپنے ہم وطن پیشرو کے فارسی اشعار کا
اردو ترجمہ کرتے رہیں گے اور اگر فیض کی بعض
نظموں میں کلامِ اقبال سے مستعار لیے ہوئے
مضامین و موضوعات اور بعض اوقات تو لب و لہجہ بھی ،
مشاہدے میں آئیں تو یہ امر واقعہ ادب کے ارتقا۔

نقطۂ نظر سے بالکل فطری ہے۔''

فیض نے اقبال سے اثر لیا ان کی غیر معمولی شخصیت سے متاثر ہونا اور بات ہے لیکن فکری اور نظریاتی اعتبار سے اقبال اور فیض کے درمیان ایک انسانی اور اخلاقی رشتہ ضرور تھا ___ لیکن آگے چل کر ان راستوں کی شاخیں پھوٹ گئیں اور فیض مکمل طور پر اشتراکی راہوں پر چلے گئے اور رومان اور اشتراک لازم وملزوم بن کر ایک تصویر کے دو رُخ بن گئے جبکہ اقبال کے یہاں اشتراکیت کی پسندیدگی محدود و مشروط تھی اور رومان کا جدید تصور اقبال کی شاعری میں ان معنوں میں نہ تھا جو بعد میں عموماً ترقی پسند شعراُ اور خصوصاً فیض کی شاعری میں جلوۂ حسن یاراں و دوراں بن کر اُبھرا۔ تاہم اقبال کی انسان دوستی، اخلاق پسندی، حرکت و عمل جیسے موضوعات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ فیض متاثر تھے لیکن فیض ایسے شاعر بھی نہ تھے کہ تاثر پہلی سطح پر نمایاں طور پر اچھل کر آ جائے کہ فیض کی شاعری اثرات کو جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد لڈ میلا، ن۔م۔راشد، خورشید انور جیسے دوستوں کا ذکر کرتی ہیں۔ ان دونوں کے بارے میں ایک ایک جملہ دیکھئے ___ ''بعد میں ن۔م۔ راشد جدیدیت کے علمبردار مشہور شاعر بنے اور تقدیر کی ستم ظریفی کہ فیض کے اہم ترین حریف ___ '' خورشید انور موسیقی کا ماہر تھا جس کی صحبت سے فیض کو موسیقی سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسی کی وجہ سے بقول ___ ''موسیقی فیض کی زندگی میں داخل ہوگئی ان کی بہت ساری نظموں سے جو موسیقی کی تشبیہوں اور پیکروں سے بھری پڑی ہیں۔ ان کے عنوانات ہی سے اس کی نشاندہی ملتی ہے مثلاً سرودِ شبانہ، سرور، گیت، ایک نغمہ وغیرہ۔

چوتھے باب کا آغاز اقبال کے چند اشعار سے ہوتا ہے۔ اس باب کا عنوان ہے آغاز سفر..... ۱۹۳۵ء میں جب فیض ایم۔اے۔او کالج امرت سر میں ملازم ہوئے اور پانچ سال تک رہے۔ مصنفہ نے اس ملازمت اور قیام کو فیض کی

زندگی کا ایک اہم موڑ کہا ہے اور یہاں تک کہا........ ''اس شہر میں دراصل ایک نئے فیض نے جنم لیا جو دنیا کو دوسرے ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا تھا۔'' ایک اور پتے کی بات وہ لکھتی ہیں کہ امرت سر آنے سے قبل کی دلچسپی شاعری، موسیقی، مصوری، عشق و محبت سے زیادہ تھی سیاست سے دلچسپی محض ساعت یا معمولی گفتگو کی حد تک تھی لیکن امرت سر آنے کے بعد محمود الظفر اور رشید جہاں سے ملاقاتوں اور ان کی محفلوں میں شریک ہونے اور مباحث کے دوران ان کی دلچسپی سیاست سے بڑھنے لگی فیض یکا یک اپنی توقع کے خلاف ساجی اور سیاسی زندگی میں پوری طرح ڈوب گئے۔ انھوں نے پہلی بار ان مسائل کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی۔ محمود الظفر اور رشیدہ کی شخصیت اور خیالات سے فیض غیر معمولی متاثر ہوئے۔ لُدمیلا نے ایک رُخ یہ بھی دیا کہ سیاست میں غیر معمولی دلچسپی لینے کی وجہ عشق کی ناکامی کو بھلا دینے کا معاملہ بھی تھا حالانکہ یہ خیال سوال کی طرح ہے جواب کی طرح نہیں۔ رشیدہ نے کہا کہ ناکامئی عشق معمولی واقعہ ہے، زندگی کسی بڑے مقصد کے لئے وقف ہونی چاہئے پھر یہ بلیغ بات لکھی.... ''یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ انقلابی جوش وخروش کے عروج کے دور میں بلند مقاصد اور ساجی نصب العین کو سبھی ذاتی مفادات اور جذبات پر ترجیح دی جاتی تھی۔'' ایسا نہ تھا کہ محض انقلاب کی وجہ سے فیض اس رجحانات کے قریب آئے بلکہ انھوں نے دیکھا کہ اس رجحان میں بقول فیض...''انسان اور فطرت، فرد اور معاشرہ، معاشرہ کا طوفان۔ انسانوں کے پیچھے پیچھے در پیچھے اور تہہ در تہہ رشتے قدریں عقیدے وغیرہ کے بارے میں یوں محسوس ہوا کہ کسی نے پورے خزینہء اسرار کی کنجی ہاتھ میں تھما دی۔'' یوں فیض کی دلچسپی سوشلزم اور مارکسزم سے پیدا ہوئی پھر لینن کی کتابیں پڑھیں اکتوبر انقلاب کو سمجھا۔ لُدمیلا نے ان سب باتوں کا نچوڑ نکالا۔

''تو یہ وہ ہلکا سا ٹھوکا تھا جس نے ادبی خواب وخیال
اور غم دل کی دنیا سے فیض کو حقیقی واقعات کے بیچوں بیچ پہنچا دیا
ان کے وہ تمام مشاہدات، معلومات، اور احساسات جو

اس وقت تک کہیں ان کے تحت الشعور میں جمع ہو رہے

تھے اب فعال ہو گئے ۔ان میں جان پڑ گئی ۔.....''

اس تبدیلی نے اُنھیں باعمل بھی بنا دیا اور وہ جلسوں ۔مزدور کی بستیوں میں جاتے اور انھیں آزادی کا مفہوم سمجھاتے ان کی غریبی و مفلسی کی وجہ بتاتے ساتھ ہی ساتھ وہ خود بھی کچھ سیکھتے اس عمل سے ان کے ذہن اور روژن میں وسعت آئی اب فیض محفل سے نکل کر معاشرہ میں آ چکے تھے اور خواص سے نکل کر عوام کے درمیان پہنچے تھے ۔ان کے شائقین کا حلقہ مخصوصین سے نکل کر طلبا و دفتر کے ملازمین اور عام انسان ہو چلا تھے ۔ایک شرمیلا فیض جوشیلا فیض بن چکا تھا اور غم دل غمِ جاناں میں تبدیل ہو چکا تھا ۔غمِ دل کا ایقان لاہور میں تھا اور غمِ جہاں کا عرفان امرت سر میں ہوا لیکن اچھی بات یہ رہی کہ غمِ دل اور غمِ جہاں الگ الگ نہیں ہوئے بلکہ باہم پہلے دست و گریباں رہے ۔پھر رفتہ رفتہ اسے ایک وحدت اور اکائی کی شکل ملنے لگی یہ چند اشعار دیکھئے ۔

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار

اُلجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار

چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب

ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار

محبتیں جو فنا ہو گئیں ہیں میرے ندیم

فیض کی ابتدائی شاعری کا یہ پہلا دور بیحد اہم ہے امرت سر کے قیام کو ہی خود فیض اپنی اصل شاعری کا پہلا دور مانتے ہیں ۔یہاں سے ان کے تخلیقی عمل میں غیر معمولی بدلاؤ آیا اور وہ صاف کہہ اٹھے ۔مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ ...'' یا ''تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے ۔'' عاشق فیض مجاہد فیض میں تبدیل ہو گیا، جمال جلال میں کروٹیں لینے لگا لیکن عشق اور جہاد الگ الگ نہیں رہے جمال اور جلال بھی گلے ملتے رہے ۔جلال فکر سے وابستہ ہو گیا اور جمال اسلوب سے ۔سب کچھ پرانا تھا لیکن امتزاج و انجذاب نیا، معنی نئے ذائقہ نیا ۔احساس نیا بس فیض مکمل فیض ہوتے

چلے گئے اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

پانچویں باب کا تعلق ترقی پسند تحریک سے ہے۔ابتداان جملوں سے ہوتی ہے۔

''اس تحریک کی تنظیمی تشکیل میں فیض کے نمایاں
کرداراور مستقبل میں فیض کے انجمن سے تعلق کی نوعیت
کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی۔اس کے باوجود
انجمن کے قیام سے متعلق بعض حقائق اور تفصیلات سے
ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کن رجحانات اور تصورات کو
سامنے رکھتے ہوئے فیض تحریک میں شامل ہوئے اور
خود کو ترقی پسند ادیب گردانتے ہوئے جلد ہی وہ در
حقیقت انجمن سے لاتعلق کیوں ہو گئے۔''

آئندہ اوراق میں انھیں خیالات اور سوالات کے جوابات پیش کیے گیے
ہیں۔

لندن کی واپسی پر سجاد ظہیر سید ھے الہ آباد آئے جہاں ان کے والد وکالت کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ سجاد ظہیر بھی وکالت کریں لیکن برطانیہ سے بیرسٹری کرنے کے باوجود سجاد ظہیر کا وکالت میں جی نہ لگا اور وہ ادبی سرگرمیوں ۔انجمن کی تشکیل میں مصروف ہو گئے اور اسکی ابتدا الہ آباد سے ہی کی۔انھیں دنوں الہ آباد میں ادارہء ہندوستانی اکادمی کی جانب سے اردو ہندی ادیبوں کی ایک کانفرنس ہونے والی تھی۔سجاد ظہیر اور ان کے دوستوں (اعجاز حسین۔احمد علی۔فراق گورکھپوری وغیرہ) نے اس موقع کا فائدہ اُٹھا کر اپنے گھر پر ایک مخصوص میٹنگ کا اہتمام کیا جس میں پریم چند۔جوش ملیح آبادی۔عبدالحق۔رشید جہاں۔دیا نرائن نگم شریک ہوئے۔اس میٹنگ میں انجمن کا منشور پڑھا گیا تھوڑی بہت گفتگو ہوئی پورے طور پر اتفاق کرتے ہوئے اُن بڑے ادیبوں نے اس منشور پر دستخط کر دیئے اس کے بعد ہی یہ فیصلہ لیا گیا کہ لکھنو میں کانفرنس کی جائے (اس کی تفصیل سجاد ظہیر

نے روشنائی میں پیش کی ہے) اور کانفرنس سے قبل پنجاب کا سفر کیا جائے جہاں امرت سر کے ایک کالج میں محمود الظفر وائس پرنسپل تھے اور ان کی اہلیہ رشید جہاں پریکٹس کرتی تھیں۔ یہ سارے اہم اور قارئین فیصلے الہ آباد کی مذکورہ میٹنگ میں ہی لئے گئے۔لُد میلا واسی لیوا پریم چند، جوش وغیرہ کا ذکر تو کرتی ہیں لیکن الہ آباد کا ذکر نہیں کرتیں۔ایک لُد میلا کیا الہ آباد میں ہوئی اس ابتدائی اور یادگار میٹنگ کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے جبکہ دیکھا جائے تو ہندوستان کی پہلی میٹنگ۔اہم فیصلے دستخط سب کچھ الہ آباد میں ہوئے۔لکھنوء میں تو محض کانفرنس ہوئی۔الہ آباد کی اس میٹنگ کے بعد سجاد ظہیر فوراً پنجاب چلے گئے جبکہ لُد میلا لکھتی ہیں۔...پنجاب کے ادیبوں سے سجاد ظہیر سب سے آخر میں ہی ربط قائم کر سکے یہ سراسر غلط ہے جبکہ حقیقت یہ ہے پنجاب کے ادیبوں سے سب سے پہلے رابطہ کیا گیا۔روشنائی میں ایک جگہ خود سجاد ظہیر لکھتے ہیں...''رشید جہاں جب الہ آباد سے امرت سر واپس جانے لگیں تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ میں بھی ان کے ساتھ پنجاب چلوں تاکہ ہم وہاں کے ادیبوں سے مل کر براہ راست گفتگو اور تبادلہء خیال کر سکیں چنانچہ جنوری ۳۶ء میں میں پنجاب کے لئے روانہ ہو گیا۔'' پنجاب میں سجاد ظہیر نے محمود الظفر اور رشید جہاں کے یہاں قیام کیا اور انھیں کے توسط سے امرت سر اور لاہور کے ادیبوں و شاعروں سے ملاقاتیں کیں۔انھیں ملاقاتوں میں ایک بیحد اہم ملاقات اور دریافت فیض کی تھی جو اسی کالج میں انگریزی کے استاد تھے جس میں محمود الظفر وائس پرنسپل تھے۔لُد میلا پنجاب کے سفر کی روداد مختصراً لکھتی ہیں لیکن اول و آخر کے فرق کو دور نہیں کر پاتیں۔

اگلے اوراق میں اسی سفر میں فراق سے ملاقاتیں۔باتیں ملتی تو ہیں لیکن فیض کے عشق کا معاملہ۔مینی فسٹو کا معاملہ۔ملاقات کا دلچسپ واقعہ وغیرہ کا ذکر نہیں ملتا۔جبکہ یہ سب فیض کے حوالے سے بیحد اہم ہیں وہ خود لکھتی ہیں۔

''اب فیض نے خود کو ادب کے اپنے مخصوص
شعبے میں کس قدر دوسری ہی حیثیت سے محسوس کیا

اچانک ان پر بحیثیت شاعر ایک نئے شعورِ ذات اور
دنیائے ادب میں اپنے مقام کا انکشاف ہوا....''

اور آگے لکھتی ہیں...

''سجاد ظہیر سے ملاقات فیض کی زندگی کی راہ کا ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔''

بہر حال امرت سر کی پہلی ملاقاتوں کے بعد ایک بڑے مقصد کی تکمیل اور تحریک کی تشکیل کے لئے دونوں اجنبی دوست لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ لاہور کی ملاقاتوں کا ذکر بھی نہ کے برابر ہے اور فوراً گفتگو لکھنوء کی کانفرنس پر ہونے لگتی ہے۔ انتظام وغیرہ پر گفتگو کم پریم چند کے خطبہ پر نسبتاً زیادہ۔ لُدمیلا کا خیال ہے کہ پریم چند کے اس خطبہ کا اثر فیض پر کچھ اس طرح پڑا کہ فیض نے اس سے متاثر ہو کر بہتیرے اشعار کہے اور فن و ادب کے بارے میں اپنے مضامین میں بار ہا پریم چند کے الفاظ کا حوالہ دیا جبکہ بعد کی ایک گفتگو میں پریم چند کے بارے میں فیض کے یہ جملے ملاحظہ کرتے چلیئے۔

''پریم چند کو کردار نگاری میں خاص مہارت تھی
لیکن وہ اس میں یکساں طور پر کامیاب نہیں ہوئے۔
ان کے بیشتر مرد و زن مثالی یا TYPICAL کردار
ہیں........ پریم چند کی کردار نگاری بہت حد تک محدود
ہے جو ناول نویس صرف ایک ہی طبقہ کی زندگی کو
نمایاں کر کے دکھانے کے قابل ہو اسے حقیقت نگاری
نہیں کہا جا سکتا۔ حقیقت ایک جامع چیز ہے اور اس کی
وضاحت وہی شخص کر سکتا ہے جس کے ذہن میں سماج
کا عمومی تصور ہو اور پریم چند نے ذہن میں یہ تصور
موجود نہیں تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کے بہت سے پہلو
ایسے ہیں جن کے متعلق نہ صرف پریم چند خاموش

رہتے ہیں بلکہ دانستہ طور پر اُن سے چشم پوشی کرتے ہیں
میں سمجھتا ہوں کہ وہ اور جو کچھ بھی ہوں حقیقت نگار ہرگز
نہیں کہلا سکتے ....''

اور آگے ایک جگہ لکھتے ہیں.........

''پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں پر ابھی سب
سے بڑا اعتراض باقی ہے۔ ناول کے متعلق تو یہ ہے کہ
وہ ناول کی بناوٹ سے اچھی طرح واقف نہیں چنانچہ
ان کے ناول میں کہانی تو ہوتی ہے لیکن نہ تو وہ اُس میں
توازن قائم رکھنے کا خیال رکھتے ہیں اور نہ ڈھنگ کا
پلاٹ بنا سکتے ہیں محض کہانیاں بیان کر لینا تو کوئی ایسا
کمال نہیں۔ پریم چند کے ناول اس لحاظ سے بہت
ڈھیلے اور بے ڈول دکھائی دیتے ہیں۔ ''

پریم چند سے متعلق فیض کے یہ خیالات بعد کے ہیں ہوسکتا ہے ابتداً وہ متاثر ہوئے ہوں یا کانفرنس کے خطبہ نے تھوڑا بہت اثر ڈالا ہو ____

لُدمیلا کانفرنس کا ذکر کم بلکہ اس میں پیش کئے جانے والے مینی فیسٹو کے خیالات ونظریات پر گفتگو زیادہ کرتی ہیں ایک جگہ لکھتی ہیں ____ ''انجمن ترقی پسند مصنفین ہندوستان کے لئے ادب عوام کے لئے نئے ہیں کے نعرے نے بنیادی حیثیت اختیار کرلی۔'' کانفرنسیں ہونے لگیں۔ رسالے ہمنوائی کرنے لگے۔ ان سب میں فیض کہاں کہاں رہے اس کا اشاروں میں اظہار ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً فیض کا ادب لطیف کی ادارت میں شامل ہونا اور ادبی صحافت سے وابستہ ہونا جس کے لئے مصنفہ لکھتی ہیں ____ ''اب فیض کو اپنا دوسرا پسندیدہ شغل مل گیا اب سے ادارت کا کام عملاً ان کی زندگی کا ایک اہم جُز بن جائے گا۔''

اس کے بعد امرتسر میں ۱۹۳۸ء میں انجمن کی کانفرنس کا انعقاد، مشاعرے

کا اہتمام اور اہتمام کی ساری ذمہ داری فیض کے سر۔ اس ضمن میں وہ یہ لکھ گئیں کہ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے پریم چند امرتسر آ گئے تھے جبکہ یہ سراسر غلط ہے کہ پریم چند کا انتقال اکتوبر ۳۶ء میں ہو چکا تھا۔

آگے بڑھ کر لُدمیلا نے تحریک کے بارے میں زیادہ لکھا فیض کے بارے میں کم لیکن تحریک کے سلسلے میں ساری گفتگو معلوماتی اور تجرباتی ہے۔ کہیں کہیں ضمنی طور پر فیض کا ذکر آتا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کا قیام (۱۹۲۹) اور انجمن سے اس کا نظریاتی اختلاف، راشد کا بیان اور پھر مصنفہ کا اپنا خیال لکھتی ہیں۔

''حلقۂ ارباب ذوق کے اراکین کو دلچسپی زیادہ تر انسانی نفسیات کے پر اسرار عوامل اس کے مختلف پہلوؤں، فرد کے افعال و اعمال کے مخفی محرکات اور اس معینہ صورت حال سے تھی جو کسی شخص کو درپیش ہو۔''

انجمن نے حلقہ کو رجعت پرست قرار دیا اور ان کے تخلیقی طریقِ کار کو جدیدیت کا نام دیا گیا۔ دوسری طرف حلقہ کے افراد انجمن یا تحریک کو سراسر پروپیگنڈے کا نام دیتے تھے اور شاعری کے نام سے منظوم انقلابی نعروں کی ہنسی اُڑاتے تھے۔ لُدمیلا ایک طرف اس نکتہ چینی کو درست مانتی ہیں تو دوسری طرف انجمن کے عوامی اور انقلابی کردار کو پسند بھی کرتی ہیں۔ آگے چل کر دونوں کی خدمات اور فرق کو بھی پیش کرتی ہیں اور کہتی ہیں ___ ''ترقی پسندوں کی طرح اردو شاعری کے ارتقا اور کیفیت کے اعتبار سے اُسے ایک اور ہی سطح پر پہنچانے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ترقی پسندوں نے شاعری کو موضوعاتی دائرے کو بے حد وسعت عطا کی تو اراکین حلقہ نے شاعری کے نئے فنی وسائل سے اردو شعریات کو مالا مال کیا'' ___ اس کے بعد راشد، میراجی اور فیض کی مثالوں سے اپنی بات مکمل کرتی ہیں۔ باب کے آخر میں ارباب ذوق کے تعلق سے فیض کے خیالات پیش کئے گئے ہیں جو خاصے کارآمد ہیں۔ اسی طرح راشد کے خیالات ترقی پسندوں کے بارے میں۔ فیض کے متعلق

ایک بار ایک بات یہاں پر اُبھرتی ہے کہ فیض تنظیم سے زیادہ تحریک کے قائل تھے۔
ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> ''تنظیمیں تو ختم ہوتی اور بنتی رہتی ہیں لیکن
> تحریکیں ختم نہیں ہوتیں۔ترقی پسندی ہم نے تو پیدا
> نہیں کی تھی وہ تو شروع سے چلی آرہی تھی۔ حالات
> کے تقاضے نے ایک تنظیم کو جنم دیا اور پھر حالات ہی کی
> بنا پر تنظیم ختم بھی ہوگئی لیکن تحریک کہاں ختم ہوتی ہے۔''

اور آگے کہتے ہیں کہ مختلف افراد اور گروہوں کی کوششوں کو اکٹھا اور منظم کرنے کے لئے ایک ادارے کی ضرورت ہے۔فیض کا خیال تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین اس مقصد کو پورا کرتی ہے لیکن وہ انجمن کے بعض رویّوں سے مایوس رہتے۔صبح آزادی نظم پر جس طرح ان کے اپنے ہی حلقۂ نظر کے دوستوں نے اعتراضات کئے یا بعض حقیقت پرستی سے متعلق شاعروں کو انجمن سے اخراج کے حوالے سے فیض نے اختلاف کیا لیکن ان کی ذرا بھی نہیں سُنی گئی جس سے وہ دل برداشتہ ہوئے لیکن خاموش رہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے فیض تحریک سے چند سال تک ہی وابستہ رہے پھر بہت جلد علیحدہ ہو گئے۔ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ پاکستان کی تشکیل کے بعد وہاں کی انجمن کی تشکیلِ نو میں وہ برابر سے شریک رہے اور وہ اخبارات جس سے وہ وابستہ رہے برابر ترقی پسندی کی حمایت میں اور آمریت و عسکریت کے خلاف برابر لکھتے رہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تنظیم سے دلچسپی کم سے کم ہوتی گئی یوں بھی فیض تحریک سے زیادہ وابستہ تھے تنظیم سے کم کیونکہ وہ نظم وضبط کے آدمی ہی نہ تھے۔ وہ اس وقت بھی زیادہ سرگرم نہ تھے جب غیر منقسم ہندوستان میں تحریک اپنے عروج پر تھی۔اس باب کے آخر میں انقلابی اور غنائی شاعری کے بار ے میں چند باتیں کی گئی ہیں جو غور طلب ہیں۔

باب چھ کا عنوان ابلیس ہے لیکن ابتدا اقبال کی موت سے ہوتی ہے اور

اس نوحہ پر بھی جو اقبال کی موت پر فیض نے کہا۔ مصنفہ نے یہ بھی بتایا کہ اقبال کے حوالے سے وہ مغربی مفکرین سے واقف ہوئے لیکن نطشے کے نظریات سے متفق نہ تھے۔ فیض آکسفورڈ کے شاعروں کے گروپ کو پسند تو کرتے تھے لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے وہ ایلیٹ سے زیادہ قریب تھے لیکن فیض دراصل حیرت انگیز آہنگ اور لطیف آوازوں کی حامل ایلیٹ کی خواص والی زبان کی شاعری کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کے بعد تاثیر کے حوالے سے فیض اور ایلیس کی ملاقاتوں، محبتوں، مزاجی اختلاف و تضاد کا دلچسپ ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد شادی، فیض اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ جانے کو ہی تھے کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ سرحدیں بند کر دی گئیں اور فیض کا سفر ملتوی ہو گیا اور ایک دوسرا ہی ماحول ہو گیا جس نے فیض کی شاعری کو راست طور پر متاثر کیا۔ وہ امرت سر سے لاہور چلے گئے۔ لکچر ہوئے اور ٹریڈ یونین میں مصروف ہو گئے اس وقت تک فیض کو وہ شہرت نہ ملی تھی جو بعد میں ملی۔ البتہ ان کے ہم عصروں میں مجاز، مخدوم، جذبی، سردار مشہور ہو چلے تھے۔ لیکن فیض کو شہرت سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ایلیس سے محبت اور رفاقت فیض کے شاعرانہ وجدان کا نیا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ محبوب کی محبت نے انگڑائی لی اور امرت سر کے قیام نے فیض کو زمانہ سے، انسانوں سے محبت کرنے کے جو آداب سکھائے تھے اور ایک نظم مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' کے ذریعہ شاعری میں انقلابی تبدیلی کا جو اعلان کیا تھا وہ آگے چل کر مُدغم ہو جاتا ہے۔ بقول لُدمیلا ؎

''فیض کی آئندہ شاعری میں روایتی محبوبہ کا پیکر
خیال سماجی اور سیاسی حقائق سے مملو استعارے کی شکل
اختیار کر لیتا ہے۔ محبوبہ کا پیکر خیالی آزادی اور وطن
کے پیکر خیالی سے مُدغم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی فیض کی
نظم میں ان کی شناخت اور میں فرق کرنا اتنا ہی مشکل
ہوتا ہے جتنا روایتی غزل میں معشوق حقیقی اور معشوق

مجازی میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے۔''

آگے چل کر اس نظم کا خوبصورت تجزیہ ہے۔ لاہور میں فیض کی مصروفیت، مختلف واقعات، ۱۹۴۱ء میں شادی اور پہلے مجموعہ نقشِ فریادی کی اشاعت۔ اگلے باب میں نقشِ فریادی پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

اس پہلے مجموعے کے بارے میں مصنفہ کا خیال ہے ___ اوّلین اشاعت کے دن سے آج تک نقشِ فریادی اردو قارئین کی مختلف پیڑھیوں کا پسندیدہ مجموعہ رہا ہے:'' ___ اور آگے لکھتی ہیں ___ ''فیض کے اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک ماہیئتی تبدیلی روبہ عمل آئی ہے جسے بعض نقادوں نے انقلابی تبدیلی کا نام دیا ہے اور جس کے نتیجے میں شاعری میں ایک نیا اسلوب بیان رائج ہوا۔ خالص کلاسیکل شعریات کا خلافِ معمول، شاندار اور پیچیدہ خوش آہنگ نغمگی اور نئی طرزِ فکر اس کی امتیازی خصوصیات ہیں ___ '' آگے چل کر کچھ اختلافی باتیں بھی ہوسکتی ہیں مثلاً ان کا یہ کہنا کہ'' اس میں شاعر کی ساری عمر کی تخلیقات کی امتیازی خصوصیات موجود ہیں۔'' یہ کیسے ممکن ہے۔ سفر جیسے جیسے کٹتا جاتا ہے نظریہ نہ سہی اسلوب و آہنگ زبان و بیان وغیرہ میں فرق تو آتا ہی ہے، مصنفہ نے اصل گفتگو کا آغاز مجموعہ کے عنوان سے کیا اور کہا کہ....... ''فیض کے شعری اسرار یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ عنوان نہ صرف اس مجموعہ کے اشعار بلکہ شاعر کی سبھی تخلیقات کے لیے اشاراتی حیثیت رکھتا ہے۔'' چونکہ عنوان دیوانِ غالب کے پہلے مصرعہ سے لیا گیا ہے اس لئے فطری طور پر غالب اور فیض کے ذہنی وفکری رشتوں پر بات آگئی ہے جو ضروری ہے کہ فیض اقبال سے گہری عقیدت رکھتے تھے لیکن غزلیہ شاعری کے حوالے سے یا شعری مزاج و مذاق کے حوالے سے وہ غالب سے زیادہ قریب ہیں تبھی مصنفہ نے کہا ___ ''فیض کی تخلیقات میں غالب ایک بہت ہی خاص مقام رکھتے ہیں۔ فیض کی تخلیقات کلام غالب سے بنیادی طور پر پیوستہ ہیں۔'' آگے چل کر اس کی وضاحت بھی کرتی ہیں اس کے بعد وہ مجموعہ میں شامل نظموں وغزلوں پر گفتگو

کرتی ہیں اور یہ اچھی بات کہی۔ ''فیض مختصر شعری تخلیقات کے شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ ان کے کلام کی غنائی ماہیئت کی بہت عمدگی سے آئینہ داری ہوتی ہے۔'' نقشِ فریادی دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ مصنفہ نے ان دونوں حصوں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ پہلے حصہ کی شاعری جو عاشقانہ ہے اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہے لیکن مصنفہ نے اس میں بھی رومانی تازگی اور مغرب زدگی کے عناصر تلاش کئے ہیں۔ مغرب زندگی کا عنصر دراصل ان کی اس افسردگی میں نظر آتا ہے جسے مصنفہ نے یوں دیکھا ــــــ

''فیض کی ابتدائی تخلیقات میں ایک مخصوص
افسردگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے ان پر مجرد غمِ
کائنات کا رنگ ہے جو مغربی رومانیت سے انتہائی
شغف کی دین ہے۔''

فیض کی افسردگی کو مکمل طور پر مغربی کہہ پانا مشکل ہے کہ اردو شاعری میں مشرقی شعریات میں پہلے ہی سے افسردگی، رنجیدگی، غم زدگی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ فیض کلامِ غالب کے عاشق تھے اور غالب کے کلام کی جن خاص خوبی نے انھیں متاثر کر رکھا تھا وہ ان کا غم اور اُداسی ہے۔ میر کا غم تو اپنے آپ میں ایک دبستانِ فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں وہ اور آگے لکھتی ہیں ــــــ افسردگی ان کی شاعری کے مفہوم زیریں کا ایک جز و لاینفک بن گئی اس عجیب بے چینی کا سرچشمہ بنی جس سے ان کے کلام کی ساری شعری فضا پُر ہے۔'' یہ محض مغرب یا رومانیت سے ممکن ہوا ہو ممکن نہیں۔ اس کے بعد وہ دوسرے حصہ کی طرف آ جاتی ہیں جہاں سے اصل ترقی پسند فیض کا آغاز ہوتا ہے اور اس قطعہ کا ذکر کرتی ہیں جو نقشِ فریادی کے پہلے صفحہ پر درج ہے۔

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج

سخت ویراں ہے محفلِ ہستی

اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

غمِ دل کی جگہ غمِ دوست کا استعمال کر کے فیض ایک نیا پیغام ہی نہیں شاعری اور سماج سے متعلق ایک نظریہ بھی دیتے ہیں۔ یہ نظریہ خیالی نہیں بلکہ بقول مصنفہ ـــــ ''ان کا موضوع عشق دوست روایتی پیکرِ خیال نہیں بلکہ ان کے ہم عصر ایک حقیقی شخصیت جس سے تعلق کی نوعیت نظریۂ حیات کا تعین کرتی ہے۔'' عین ممکن ہے کہ یہ اثر انھوں نے اپنے پیش رو شعرا حسرت موہانی، اختر شیرانی وغیرہ سے لیا ہو کہ یہ دونوں کچھ ایسے ہی محبوب کا تصور پیش کر رہے تھے اور فیض ان سے متاثر بھی تھے۔ مصنفہ نے فیض کی نظم مجھ سے پہلی محبت ....کو گریزیا موڑ قرار دیا ہے یعنی اسی نظم سے شاعر کے مستقل موضوعات میں سے ایک یعنی'' شاعر اور سماج'' کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں سے اس دنیا میں محبِ وطن شاعر کے مقام کی تلاش شروع ہوتی ہے۔

نظم سوچ، موضوع سخن پر گفتگو کرتے ہوئے وہ درمیان میں ایک کارآمد اور نازک بات یہ کہتی ہیں----

'' فیض کی سماجی اور سیاسی موضوع والی تخلیقات کی امتیازی خصوصیت ان کا بلند آہنگ اور گونجتا ہوا لب ولہجہ ہے (فیض کے لیے ایسا لب و لہجہ پیدائشی نہیں اکتسابی ہے۔) ان میں صفتِ مجاز مرسل باکثرت استعمال کی گئی ہے غیر معمولی تشبیہات اور دلکش صفات جن سے مضمون پیچیدہ بھی نہیں ہوتا ۔ ان کی امتیازی خصوصیت ہیں۔اظہارِ خیال کو موثر بنانے کے لیے مختلف النوع فنی وسائل اور مناسب اور قافیوں سے کام لیا گیا ہے۔اس زمرے کے اشعار کافی سیدھے

سادے ہیں گویا کہ بغور پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ
اس لیے تخلیق کیے گئے ہوں کہ کثیر التعداد سامعین
انھیں سنتے ہیں سمجھ جائیں۔''

اس کے بعد پھر ہم لوگ، کتے، رقیب وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے رقیب سے فیض کی منفرد و ممتاز نظم ہے۔ مصنفہ نے اسے مجھ سے پہلی سی محبت ....کی توسیع کہا ہے اور یہ بھی کہ بعد کی نظم میں اظہارِ خیال کی منطق زیادہ معقول ہے۔'' اور یہ بھی ....''اردو شاعری کے ارتقا کے لیے بھی یہ نظم خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں صنفِ شاعری کے ایک خیالی پیکر کی قلب ماہیئت ہوئی ہے اور اس کے مفہوم میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ یہ ہمارے سامنے اس امر کی ایک اور مثال ہے کہ فیض کیسے روایتی مضامین کو نیا مفہوم دیتے ہیں اور پرانے استعاروں کی قلب ماھئیت کرتے ہیں۔''

اس کے بعد وہ مشہور نظم تنہائی پر تفصیلی گفتگو کرتی ہیں۔ ابتدا میں لکھتی ہیں ....''تنہائی ۱۹۳۹ء کے بعد فیض کی بیشتر نظموں سے رجائیت کے فقدان کی وجہ سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔'' نظم میں چیستان ہے نہیں معلوم کہ اسے کس کا انتظار ہے۔ کس بات کی تنہائی ہے۔ الگ الگ فکر کے نقادوں نے الگ الگ تعبیریں کی ہیں جس کو وہ پیش کرتی ہیں۔ بعد میں یہ بھی کہتی ہیں کہ.......'' غنائی تخلیق کی خوبیوں میں سے ایک کثیر معنوی تشریح کا ممکن اور جائز ہونا بھی تو ہے۔'' اور پھر یہ نتیجہ............''اس میں شک نہیں کہ قاری کے ذہن میں اس شاہکار نظم کی تعبیر ناقدین کی رائے پابند نہیں رہ سکتی۔'' آخر میں یہ بھی کہتی ہیں ....''اس نظم میں بظاہر تو ایک انسان کی مایوسی کے عروج کا بیان کیا گیا ہے جسے انتظار کا کوئی ثمرہ نہیں ملا لیکن اس کے باوجود اگر غور سے دیکھا جائے تو نظم کا سارا ماحول زندگی سے بھرا ہوا ہے۔''

ایک مختصر سی گفتگو اس مجموعہ کی غزلوں پر بھی ہوتی ہے اور اسی پر اس بات

کا خاتمہ ہوتا ہے۔اس کے بعد جو باب شروع ہوتا ہے اس کا عنوان ہے''فوج''۔

دوسری جنگِ عظیم کے اثرات کے تحت فیض نے حالات کے جبر اور کچھ دوستوں کے اصرار پر فوج میں ملازمت کر لی اور کپتان کے عہدے پر فائز ہوئے۔نشر و اشاعت کا شعبہ ملا جو فیض کے مذاق کا تھا جنگی خبرنامہ تیار کرنا، اطلاع نامہ تیار کرنا وغیرہ۔فیض نے یہ کام بھی ذمہ داری سے کیا۔۱۹۴۴ء میں وہ لیفٹنٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے اور کئی نمایاں خدمات کے لئے انھیں خطاب سے بھی نوازا گیا جس پر طرح طرح کے ردِ عمل بھی ہوئے۔ یہ سب تو ہوا لیکن اس درمیان یہ بھی ہوا بقول مصنفہ.......

''جنگ کے دوران شاعری کے لیے فیض کی طبیعت کم ہی موزوں ہوئی ۔ کام کا بے انتہا بوجھ، محاذ جنگ سے آنے والی اطلاعات کے پریشان کن خبرنامے اور ہر دم بے چین رکھنے والا یہ خیال کہ حکام مسلسل ان کے ہم خیالوں کے پیچھے پڑے ہیں ۔ شاعرانہ وجدان کو بڑھاوا دینے والی باتیں تو تھیں نہیں نہ وقت ملتا تھا نہ ہی فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد بدن میں دم خم رہ جاتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ شعر لکھنا وہ شاید بھول ہی گئے ہوں۔''

یہ ضرور ہوا لیکن اس ملازمت اور فوج سے وابستگی نے فیض کے دل و دماغ میں ملک ،حکمراں، سیاست اور فسطائیت کو قریب سے سمجھنے کے مواقع ملے جس سے وہ اور مضطرب رہنے لگے۔ اس اضطراب کا اثر مصنفہ نے ان کی بعض نظموں میں تلاش کیا ہے مثلاً''سیاسی لیڈر سے'' یہ لیڈر کوئی اور نہیں گاندھی ہے یہ خیال مصنفہ کا ہے اور یہ بھی کہ فیض صراحت نہ کریں تو اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یہ مشکل گاندھی نام کے احتیاط سے کہ شاعری کے احترام سے زیادہ پیدا ہوتی ہے اور

پہلی بار اردو شاعری میں ہاتھ کے محنت کی تعریف ہوتی ہے ۔

تیرا سرمایہ تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس یہی ہاتھ تو ہیں

اسی طرح وہ فیض کی ایک اور نظم ''میرے ہمدم مرے دوست'' میں ایک دوست سے خطاب ۔اس کی تھکن سے ،اس کے درد کا درماں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک مشہور نظم اے دلِ بیتاب ٹھہر میں بھی اسی تھکن ، تیرگی کا مداوا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ تسلّی بھی ۔''صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر ۔'' ان نظموں میں یا اس دور کی نظموں میں فاشزم کے تیئں زخم کھانے والوں کے لئے مرہم ہے تسلّی ہے اور انتظار ہے ۔آزادی کی للک ہے ۔غلامی سے نجات کی تڑپ ہے ۔چند برسوں کے بعد فیض فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے وجہ وہ فوجی حکام کی کارروائیوں سے ناخوش تھے ۔کچھ اور بھی اسباب تھے ۔اس ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ پھر سے لکچرر ہوئے لیکن اس بار وہ گورمنٹ کالج لاہور ملا ،تنخواہ کم لیکن فیض کو اس ملازمت سے قدرے سکون ملا لیکن تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے انھیں ٹائمز پاکستان میں بھی ملازمت کرنی پڑی اسی درمیان تقسیم ہند کا واقعہ ہوا اور پاکستان بن گیا اور فیض پاکستانی ہو گئے ....اس درمیان شاعری کی رفتار کم ہی رہی اور ایک خیال یہ اُبھرا کہ فیض نے شاعری ترک کر کے صحافت شروع کردی ۔ پاکستان ٹائمز اور امروز کی کامیابی کی وجہ سے بھی ایسا سوچا جانے لگا ۔ملک تقسیم ہو گیا ۔حالات دگرگوں ہوتے گئے ۔ایسے میں ''خون کی لکیر'' وجود میں آئی بعض نئے شعراُ کو ایک نئے ملک کی تشکیل میں نئے خواب نئی زندگی نظر آنے لگی ۔مصنفہ نے یوسف ظفر ، قیوم نظر وغیرہ کی مثالیں بھی دی ہیں اور ساتھ ہی احمد ندیم قاسمی جیسے شاعر کی نظم کے ٹکڑے بھی پیش کئے ہیں ۔چند مصرعے دیکھئے ۔

مہیب رات شفق میں نہا کے آئی ہے
مہیب رات کا انجام بھی حنائی ہے

یہ اک عجیب سا احسانِ کبریائی ہے
جو آفتاب دیا ہم کو لالہ فام دیا

ٹھیک اسی ماحول میں فیض نے صبح آزادی جیسی نظم کہی جو بیحد موثر تھی لیکن بحث طلب ہوگئی اور اس کا پہلا مصرعہ ''یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر'' ایک مصرعہ ہی نہیں محاورہ بن گیا اور یہ بھی ؎

نجاتِ دیدۂ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اس نظم کے بارے میں لُدمیلا لکھتی ہیں .... ''یہ وہ نظم ہے جو پوری ایک نسل کے ذہن میں نقش ہوگئی۔ جہاں بھی اگست ۴۷ء کا ذکر ہوتا اس کا حوالہ ضرور دیا جاتا۔ آج کل بھی جب پاکستانی یا ہندوستانی اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی فیض کی نظم کا مصرعہ..... ''یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر ضرور پڑھتا ہے۔'' ان دنوں فیض نے شعبۂ صحافت میں بیحد محنت کی اور مغربی نظام کے خلاف خوب خوب لکھا۔ گھریلو انداز پر بھی ضربیں لگائیں۔ نظم انتساب اسی دور کی یاد ہے۔ سیاسی بُحران رواں دواں تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے سجاد ظہیر ان دنوں پاکستان میں تھے لیکن زیرِ زمیں انھیں دنوں ایک واقعہ ہوا جسے راول پنڈی سازش کیس کہتے ہیں جس کی تفصیل میں مصنفہ چلی جاتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ سجاد ظہیر ،فیض اور کچھ دوسرے فوجیوں پر بغاوت کا الزام لگایا گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ یہ زمانہ لیاقت علی خاں کا تھا۔ فیض نے اسی واقعہ کو ایک جگہ یوں بیان کیا ہے.......... ''قصہ صرف اتنا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک دن بیٹھ کر بات کی کہ اس ملک میں کیا ہونا چاہئے؟ کس طریقے سے یہاں کے حالات بہتر بنائے جائیں۔ چونکہ ملک کو بنے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ گذر چکا تھا اور نہ یہاں آئین بنا تھا نہ سیاست کا ڈھانچہ ٹھیک طرح سے منظم ہوا تھا۔'' مصنفہ یہ کہتی ہیں...... ''اس ملاقات کا اصل موضوع بحث نظام حکومت کا تختہ اُلٹنا ہی تھا۔ افسرانِ فوج کی نظر میں وزیرِ اعظم لیاقت علی خاں کی نہ

صرف اندرونی بلکہ خارجہ پالیسی بھی قابلِ ملامت تھی۔'' ہر چند کہ فیض اور سجاد ظہیر
دونوں نے فوجیوں کے منصوبوں کو مسترد کر دیا کیونکہ دونوں نے صاف اندازہ لگا لیا
کہ فوجیوں کے پاس کوئی واضح تصور سیاست اور نظام حیات نہیں ہے ماحول اور
طاقت بھی نہیں ہے لیکن حکومت کی شکی نگاہوں نے ان فوجیوں کے ساتھ سجاد ظہیر اور
فیض کو بھی گرفتار کر لیا۔ فیض جس صبح گرفتار کئے گئے وہ ایک نئی صبح تھی فیض کی زندگی اور
شاعری کے لیے۔ مصنفہ لکھتی ہیں.........'' یہ صبح فیض کی زندگی اور تخلیقات کے لئے
ایک نئے مرحلے کی نشان دہی کرنے والا اگلا سنگ میل ثابت ہوئی۔'' دلچسپ بات یہ
ہے کہ جن فیض اور سجاد نے فوجیوں کے خیالات سے اختلاف کیا تھا۔ تجویز کو رد کیا
حکومت کا تختہ پلٹنا چاہتے ہیں اور اسلامی حکومت کے بجائے اشتراکی حکومت قائم کرنا
چاہتے ہیں۔ وزیرِ اعظم کے اس بیان اور میڈیا کے الٹے سیدھے پرچار کے ذریعہ
اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے ذریعہ حاصل کیا گیا ملک اور مسلم عوام پر اس
پروپیگنڈے کا کیا ردِ عمل ہوا ہوگا بقول میجر اسحاق ____ '' ہر کوئی جو خود کو آزاد خیال
سمجھتا تھا اب اس تشویش میں تھا کہ اسے کمیونسٹ قرار دے کر کسی وقت بھی دھر لیا جا
سکتا تھا۔'' اس وحشت و سراسیمگی نے پاکستانی سرزمین سے اشتراکیت کی جڑیں اکھاڑ
پھینکیں اور مذہب کے نام ایک نئی قسم کی حکومت قائم کی جس کی کچھ اس انداز سے
ابتدا ہوئی جس کا شکار آج پورا ملک ہو چکا ہے اور جس کے نتائج سامنے ہیں۔ غرضکہ
اصلی گناہگار فوجی نہیں بلکہ کمیونسٹ قرار دیے گئے۔ فیض کا شمار اصل سازش کرنے
والوں میں تھا۔ ذمہ دار اور ایماندار صحافی فیض کو انھیں اخبارات نے سازش کا روح
رواں قرار دیا۔ فیض کو غدار، باغی اور نجانے کیا کیا کہا گیا۔ فیض کے لیے یہ مصیبت
کے دن تھے۔ صابر، سنجیدہ اور بردبار فیض نے ان مصیبتوں کو صبر و تحمل سے گذارا۔ وہ
جو ہوا سو ہوا لیکن ان سب کے اثرات فیض پر یوں ہوئے بقول مصنفہ......'' ملک میں
چاروں طرف ایک دہشت اور سراسیمگی کی فضا تھی، متعدد ٹریڈ یونینو نے سیاست
سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بائیں بازو کی بعض تنظیموں نے اپنا کام بالکل بند کر دیا۔''

مقدمات قائم ہوئے۔ قانونی جواز تلاش کیے جاتے رہے۔ وقت گذرتا رہا۔ دراصل حکومت ان فوجیوں سے نجات چاہتی تھی جن پر اعتماد نہ تھا اور بقول فیض ہم تو بیچ میں یونہی آ گئے تبھی تو فیض نے کہا تھا۔ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا / وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے اور یہ قطعہ بھی ـــــــ

جان بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ عصر وضع تکلف تو دیکھئے
انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

یہ باب یہیں پر ختم ہوتا ہے اگلے باب میں ان خطوں کا ذکر ملتا ہے جو فیض نے جیل سے اپنی رفیقۂ حیات کو لکھے جس کا عنوان ہے ''صلیبیں مرے دریچے میں'' ......گرفتاری کے تین مہینے تک تو میاں بیوی کے درمیان کسی قسم کا ربط نہ ہو سکا۔ تین ماہ کے بعد جب فیض منتقل کئے جانے لگے تو پہلا خط ایلیس کو لکھا جو بقول مصنفہ.......'' ہر بُرائی میں اچھائی کی جھلک ہوتی ہے گو کہ قیدِ تنہائی فیض کے لیے انتہائی اذیت ناک تھی لیکن اس کے باوجود یہ تو ممکن ہو سکا کہ وہ شعر و شاعری پر توجہ دے سکیں۔ زندگی کے بارے میں سکون کے ساتھ سوچ سکیں'' اپنے نظریہ حیات کا تجزیہ کر پائیں، اور اعمال سے اس کا موازنہ نہ کریں۔'' اور یہ احساس بھی جاگا بقول فیض ـــــــ ''یہ یقین پہلے سے بھی زیادہ محکم ہو چکا ہے کہ زندگی خواہ کچھ بھی دکھائے بالآخر بہت خوب شے ہے اور بہت حسین بھی۔'' مصنفہ کا خیال ہے کہ اسی زمانے میں ان کی نظم دریچہ انھیں احساسات کی دین ہے۔

فیض نے جیل سے ایلیس کو بے شمار خطوط لکھے جو اولاً انگریزی میں تھے جسے ایلیس نے بہت سنبھال کر رکھا اور جسے بعد میں فیض نے ہی اردو میں ترجمہ کر کے شائع کروایا۔ ان خطوں میں فیض کی مفکرانہ و شاعرانہ شخصیت کے دلآویز اور فکر انگیز پہلو سامنے آتے ہیں۔ حیات و کائنات کے تئیں ان کے غور و فکر کے معاملات، زندگی

کا مفہوم، شاعری کا مقصدان سب پر باتیں ہوتی ہیں۔ گذشتہ تنہائی اور حساس لمحوں میں سوچی ہوئی ان تمام باتوں میں غیر معمولی کشش اور توجہ ہے۔ چار سال کی اس مُدت نے فیض کے اندازِ فکر، لہجۂ شاعری کو منقلب کر کے رکھدیا۔ دستِ صبا میں شامل نظمیں اور اس کے بعد زنداں نامہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے نقشِ فریادی کا ارتقائی و توسیعی سفر ہیں اسی وجہ سے اس باب میں نہ صرف خطوں بلکہ شاعری کے بارے میں کارآمد باتیں کی گئی ہیں۔ ان خطوں کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں۔

''یہ خطوط حیرت انگیز دستاویز کی حیثیت رکھتے
ہیں۔ ان میں نہ صرف اس وقت کی یادیں محفوظ ہیں
بلکہ ان کے مطالعے سے شاعر کی شخصیت کے مختلف پہلو
سامنے آتے ہیں اور غور وفکر کے عادی مورخ، باریک
نظر، ماہرِ نفسیات اور پیدائشی معلم کی حیثیت سے فیض کی
اعلیٰ درجے کی ذہنی قابلیت کا انکشاف ہوتا ہے۔''

ساتھ ہی وہ اپنے ہندوستانی دوستوں کو بھی بیحد یاد کرتے ہیں۔ میجر اسحاق نے لکھا ہے......''حسرت موہانی، محمود الظفر، مجاز، مخدوم، سردار جعفری، اشک، ملک راج آنند، کرشن چندر، جوش، فراق وغیرہ کا ذکر بار بار ہوتا تھا۔''

جیل کے دوران انھوں نے گہرائی سے روسی ادب اور عالمی ادب کا مطالعہ کیا۔ شاعری کی اور اتنا سرمایہ ہوگیا کہ ان کی بیگم دوسرے مجموعہ کی اشاعت کے بارے میں سوچنے لگیں۔ دستِ صبا اسی دوران شائع ہوا۔ (۱۹۵۲ء) اس کی اشاعت پر سجاد ظہیر نے کہا۔

''بہت عرصہ گذر جانے کے بعد جب لوگ راول
پنڈی کیس کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان
کا مورخ ۱۹۵۲ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو
غالباً اس سال کا سب سے اہم اور تاریخی واقعہ نظموں کی

اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دے گا۔ ''

اسی طرح کی پذیرائی احمد ندیم قاسمی نے بھی کی ہے۔اس پذیرائی سے فیض خوش ہوئے اور ادھر مقدمہ کا فیصلہ بھی آیا۔ چار سال کی قید ہوئی جس میں دو سال تو کٹ ہی چکے تھے۔فیض نے اسی موقع پر شعر کہا ۔

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ فغاں ٹھہری ہے

× × ×

جیل کی شاعری ایک الگ باب ہے جو دستِ صبا، زنداں نامہ اور دستِ تہہ سنگ کے ابتدائی حصہ تک پھیلا ہوا ہے جس پر بے شار نقادوں کے طبع آزمائی کی ہے۔ اس کتاب میں اگلا باب بھی ''اسیری کا کلام'' کے عنوان سے ہے۔فیض نے جیل خانے میں کس حقدار اور کس انداز سے شاعری کی ہے۔ابتدا میں ہی یہ جملے ملتے ہیں۔

''فیض تمہ فیض کی اسیری کے چار برس کے اندر
اندران کے مجموعے شائع ہوئے۔ قید خانے میں
جتنے اشعار لکھے گئے ان کی تعداد فیض کی ساری زندگی
کے پورے کلام کے تقریباً دو تہائی کے برابر۔
کے پہلے دنوں میں اپنے اشعار وہ اخبار کے کسی ٹکڑے
پر لکھ لیتے جو لپٹنے کے کاغذ کی شکل میں اتفاقاً ان کی
کوٹھری میں نمودار ہو جاتا تھا۔اسی طرح فیض دیا سلائی
کی ڈبیا توڑ کر یا سگریٹ کا پیکٹ پھاڑ کر اپنے لیے
''لوح'' مہیا کرتے تھے اور قلم کا کام دیتا تھا پنسل کا
ایک بچا ہوا ٹکڑا جو فیض کی شاعری کے ایک دلدادہ جیلر
نے ان کو چوری چوری پہنچا دیا تھا۔''

خود فیض ایلس کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ____ ''گرفتاری کے بعد میں

نے ابھی ابھی چھٹی نظم ختم کی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ تین برس میں جتنا جو کچھ لکھا تھا ان میں تین ماہ میں اس سے دُگنا لکھ چکا ہوں ۔'' مصنفہ نے انتساب جو کلثوم کے نام ہے اس پر بھی کافی گفتگو کی ہے کہ دوسرے زبان کے اسکالرس معمولی سے معمولی واقعہ کی غیر معمولی چھان بین کرتے ہیں ۔کلثوم فیض کی بیوی ایلیس کا مشرقی یا اسلامی نام ہے جسے فیض کی والدہ نے رکھا تھا ۔اس پر فیض اور ان کی بیوی کے درمیان دلچسپ خط و کتابت رہی جو مشرقی اور مغربی سوچ کی آئینہ دار ہے ۔ زنداں نامہ کسی کے نام منسوب نہیں ۔اس کے بارے میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خود شاعر اس مجموعہ کو دستِ صبا کا سلسلہ اور اپنی حسیات کی مزید قسط سمجھتے تھے ۔ مصنفہ نے دستِ صبا ، زنداں نامہ ۔ دستِ تہہِ سنگ میں شامل نظموں اور غزلوں کی تعداد کو بھی معنی پہنائے ہیں ۔ساتھ میں یہ بھی کہا ۔

اسیری کے برسوں میں فیض کی شاعری کی شاعری کا مصوریاتی نظام بنیادی طور پر بن چکا تھا ۔فیض نے اپنے خصوصی طرز کو تراشا بعض نئے شعری طور طریقے ایجاد کئے ۔اپنی پسندیدہ لفظی ترکیبوں ،شعری پیکروں ،تشبیہوں اور استعاروں کو نمایاں کیا اور اپنی شاعری کو نئے تجربوں سے مالا مال کیا ۔انہیں نظموں اور غزلوں میں فیض کا منفرد خصوصی رنگ نکھر گیا ان پر جو مہر لگی وہ آئندہ بھی فیض کی شاعری کی شناخت ثابت ہوئی ۔خود فیض نے کہا ۔

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز فغاں ٹھہری ہے

آئندہ اوراق میں مصنفہ کے اسی بیان کی تفصیل ملتی ہے جسے انھوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔خاص طور پر ان لفظوں اور ترکیبوں پر جو انھوں نے فارسی عربی اور کہیں کہیں انگریزی سے لی ہیں اس کے علاوہ اردو کے قدیم شعراء سے بھی مثلاً صبا کا علامتی پیکر ، اس کے بعد وہ کہتی ہیں کہ اس اسیری کے دوران انھوں نے چھ تخلیقات کی ہیں ۔ مصنفہ کا یہ بھی خیال ہے کہ ان

چھ تخلیقات کو نزدیک سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسی پر ان کے آگے کا تخلیقی سفر پھیلا ہوا ہے۔ یہ چھ تخلیقات ذیل ہیں۔

ا۔ تمھارے حسن کے نام (نظم)

۲۔ روش روش ہے وہی انتظار کا موسم (غزل)

۳۔ تم آئے ہو نہ شب انتظار گذری ہے (غزل)

۴۔ تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں (غزل)

۵۔ شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام (غزل)

۶۔ مقام لوح و قلم (قطعہ)

دامنِ یوسف (قطعہ)

اسی مقام پر ایک معنی خیز جملہ اور نکلتا ہے...... ''یہ اندازہ لگانے میں شاید ہی غلطی ہوگی کہ اپنی شاعری تخلیق کرتے وقت فیض کو نہ صرف صنف اور نہ ہی ہئیت وغیرہ کے انتخاب کا خیال تھا بلکہ گویا خود صنف اور ہئیت نے شاعر کو ڈھونڈھ لیا تھا۔ یہاں پھر سے کلاسیکی نوعیت کی مختصر صنف سخن کی طرف فیض کا قدرتی جھکاؤ ظاہر ہوا تھا۔'' اور یہ بھی کہا کہ فیض نے پرانی اصطلاحات کو نئے مفاہیم دیے۔ خاص طور پر سماجی اور سیاسی مفاہیم، مصنفہ نے یہ بھی بتایا کہ جیل خانے کی پہلی تخلیق ہے'' روش روش ہے وہی انتظار کا موسم'' فیض نے خود اعتراف کیا ہے کہ جیل خانے میں زیادہ تر اسی مزاج کی شاعری ہوئی ہے جس کی ابتدا مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب۔'' سے ہوئی تھی۔ چند فیصلہ کن قسم کے جملے ملاحظہ کیجیے۔

''اسیری کے دور کی فیض کی شاعری میں کلاسیکی
اور عصری شاعری کے اثرات کا نہایت خوشگوار امتزاج
پوری وضاحت سے منظرِ عام پر ہے۔''

''فیض کی شاعری ان کو اپنے گھر کی چار دیواری سے
نکل کر دنیا کے غموں کی بھی فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔''

اگلے باب کا عنوان ہے۔ ''منٹگری سے ماسکو تک''

جیل سے واپسی کے بعد فیض لاہور آئے پاکستان ٹائمز میں پھر سے کام کرنے لگے۔ حالات خراب تھے اس لیے ان کو گھر بار کی فکر زیادہ رہی شاعری کم ہوئی۔ مختلف ثقافتی کام کئے لیکن انجمن کی سرگرمیوں میں شرکت سے گریز کرتے تاہم ۵۶ء میں دلی کی ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کی اور تقسیم کے بعد پُرانے دوستوں سے ملے۔ ۵۸ء میں تاشقند گئے۔ افروایشائی کانفرنس میں شرکت کی۔ روس پہلی بار جانا ہوا۔ اس دیار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کے چرچے نوجوانی سے سُنتے آئے تھے۔ اسی سفر میں مہہ وسال آشنائی لکھنا شروع کیا۔ اسی کانفرنس میں ایک تجویز پاس ہوئی کہ........ ''نوآبادیات کے ثقافتی دباؤ کا مقابلہ کرنے اور نوآبادیات کا روحانی جوا اتار پھینکنے کے مقصد سے دانشوروں کو ایک نئی بلند سطح پر متحد کیا جائے۔'' اس قرارداد میں فیض کا نام سرِ فہرست تھا۔ ایسا مصنفہ نے بتایا۔

ٹھیک اسی وقت جب فیض تاشقند میں تھے۔ پاکستان میں سیاسی انقلاب آیا اور فوج کی حکومت قائم ہوئی اور جنرل ایوب خاں نے حکومت سنبھالی۔ ترقی پسندوں کو گرفتار کیا جانے لگا۔ فیض تاشقند سے لوٹ رہے تھے۔ دوستوں نے آنے کو منع کیا لیکن وہ مانے نہیں بیٹی کی سالگرہ تھی۔ سالگرہ میں شرکت تو ہوگئی لیکن چار دن کے بعد ایک بار پھر گرفتار کر لئے گئے۔ لاہور جیل میں رکھے گئے لیکن اس بار وہ گھبرائے نہیں اور کہا۔

ہوئی ہے پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہے اک جانب مچا کہرام دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

اس بار فیض پر روس کے جاسوسی اداروں سے خفیہ تعلق رکھنے کا الزام تھا۔ تقریباً چھ ماہ بعد رہائی تو ہوئی لیکن فیض کچھ زیادہ ہی ذہنی انتشار کا شکار رہے۔ خود لکھتے ہیں۔

''زنداں نامہ کے بعد کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری

کا زمانہ ہے جس میں اپنا اخباری پیشہ چھوٹ گیا۔ایک
بار پھر جیل خانے گئے۔ مارشل لا کا دور آیا اور ذہنی اور
گردوپیش کی فضا پھر سے انسدادِ راہ اور کچھ نئی راہوں کی
طلب کا احساس پیدا ہوا۔''

یہی وجہ ہے کہ جب زنداں نامہ کے بعد دستِ تہہ سنگ شائع ہوا تو اس میں بقول مصنفہ...... ''مختلف کیفیتوں کی تخلیقات ہیں۔ان میں دنیا کی نیکی اور انصاف کی فتح کی آرزو۔امید اور یقین کے مختلف رنگ، حسنِ قدرت کے نظاروں کی خوشی اور مرحوم دوستوں کے سوگ جیسی کیفیتیں پائی جاتی ہیں ____ ''اسی ضمن میں، وہ نظریۂ شاعری کے حوالے سے شام نظم کا ذکر بطور خاص کرتی ہیں اور کچھ ویران نظریہ شاعری پر گفتگو کرتی ہیں اور یہ کہتی ہیں ....''دست تہہ سنگ میں دل فریب رومانی نوعیت کے اشعار کی تعداد کے مقابلے کہیں ایسی نظمیں زیادہ شامل ہیں جو پراگندہ حالات کے سلسلے میں شاعر کی تشویش کی آئینہ دار ہیں۔''

۱۹۵۹ء میں پطرس بخاری کے انتقال کے بعد فیض لاہور سے کراچی چلے آئے۔ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا لیکن کراچی کی آب وہوا راس نہ آئی اور وہ واپس لاہور لوٹ آئے لیکن صحت خراب رہنے لگی اسی درمیان انھیں لینن انعام سے نوازا گیا۔انہیں روس جانے کی اجازت مل گئی۔انعامی تقریب میں فیض نے شاندار تقریر کی جو دستِ تہہ سنگ میں شامل ہے جس کا آخری جملہ یہ تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے
دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب
ہو کر رہے گی۔''

پاکستان میں سیاسی تبدیلی، فیض کا سبط حسن کے ساتھ جریدہ لیل و نہار نکالنا۔ثقافت سے دلچسپی قومی تھیٹر کا انتظام، ریڈیائی ڈرامے، پاکستان کی ثقافت کی اکائی کی تلاش۔اسلامی نظریہ کی رکاوٹ یہ سب مباحث اس باب میں ملتے ہیں۔فیض

ان مسائل پر اکثر سوچتے لکھتے۔ ۱۹۷۶ء میں ہماری قومی ثقافت نام کی کتاب بھی شائع کی۔ غرضکہ صحافت، سیاست، ثقافت سے کام عشق سبھی کچھ آدھے ادھورے انداز میں چلتے رہے اسی زمانے میں اسی انداز سے ایک مزاحیہ نوعیت کی '' کچھ عشق کیا کچھ کام کیا'' کہی۔

لینن انعام کے بعد فیض کی شہرت وعظمت میں اضافہ ہوا اور ساتھ ہی ان کی مصروفیت میں بھی۔ بیرونی ممالک کے سفر بڑھے۔ کام بڑھے، تحریر وتقریر وتراجمے کے سلسلے بڑھتے گئے اور فیض مصروف سے مصروف تر ہوتے گئے۔

اگلا باب (تیرہ) ''فیض احمد فیض اور سوویت یونین'' کے عنوان سے ہے جس کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے۔ ''فیض احمد فیض کی باشعور زندگی کا زیادہ تر حصہ سوویت یونین سے وابستہ رہا تھا۔ ماسکو روس اور سوویت یونین کے لیے ان کا جذبہ جس کو غالباً رغبت کہنا سب سے مناسب ہوگا ان کے نظریات کا ایک جُز تھا۔'' اس باب میں روس سے ان کی وابستگی تو نظر آتی ہے نیز روسی زبان میں فیض کی مقبولیت ان کی شاعری کے ترجموں پر روشنی ڈال گئی ہے۔ روسی زبان میں فیض کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ فیض کو لینن انعام سے نوازا جانا تھا اور ان کی اشترا کی ومزاحمتی شاعری کو اپنے مذاق ومزاج سے ہم آہنگ پانا بھی تھا۔ خود فیض نے روسی عوام اور روس ملک پر کئی نظمیں کہی ہیں جو روسی زبان میں بیحد مقبول ہوئیں۔

اس کتاب کا آخری باب ''مرے دل مرے مسافر'' کے عنوان سے ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اس باب کا آغاز پاکستان کی تقسیم سے ہوتا ہے جب بنگلہ دیش بنا۔ فیض پر اثر پڑا۔ ۱۹۷۸ء میں جب فیض کا مجموعہ شامِ شہر یاراں شائع ہوا تو اس میں اس قسم کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

ہم کیا کرتے کس رہ چلتے　　　ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے

ان صدیوں کے یارانوں کے ان رشتوں کے جو چھوٹ گئے
جو اک اک کر کے ٹوٹ گئے

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت آئی فیض کی امیدیں بندھیں کیونکہ بھٹو نے اسلام جمہوریت اور سوشلزم کا نعرہ بلند کیا۔ سجاد ظہیر کی موت پر نوحہ، بنگلا دیش کا سفر سبھی کچھ اس مجموعہ میں شامل ہے۔ اسی دور میں اقبال کی پیام مشرق کا ترجمہ مکمل کیا پھر فوجی حکومت کا قیام اور خود فیض فوج کی نگہبانی میں آ گئے۔ یہ دور ''ضیاالحق کا تھا۔ ان حالات میں فیض نے ملک چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور ایک دن خاموشی سے ملک سے باہر نکل آئے .....وطن سے نکلنے کے بعد وہ بیروت پہنچے اور لوٹس (Lotus) رسالہ کی ادارت کا کام سنبھال لیا۔ اس درمیان ہندوستان سے کئی آفر دیئے گئے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر وغیرہ لیکن وہ بیروت گئے اور فلسطینی حالات پر سنجیدگی سے غور وخوض کرنے لگے اور یاسر عرفات کے قریب آئے۔ بیروت اور فلسطین پر کئی نظمیں کہیں۔ ایک نظم تو فلسطینیوں کا جیسے قومی ترانہ بن گئی۔

ہم جیتیں گے
حقا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

بیروت کے حالات بیحد خراب تھے۔ فیض کو یہاں بھی چین نہ ملا۔ ایک دن بم کا دھماکے سے بچے۔ اس دور کی شاعری مرے دل مرے مسافر اور غبار ایام میں ملتی ہے۔

فیض پھر ماسکو آ گئے۔ لوٹس دیکھنے لگے۔ افروایشیا تنظیموں کی طرف توجہ کی۔ فیض کو وطن کی یاد ستانے لگی ادھر ضیاالحق نے بھی وطن واپس آنے کی دعوت دے ڈالی۔ ۱۹۸۲ء میں وہ پاکستان آ گئے۔ بیمار پڑ گئے۔ ۱۹۸۳ء میں وہ پورے طور پر لاہور آ گئے۔ صحت خراب ہو چکی تھی۔ آخری لمحوں میں یہ تحریریں ملاحظہ کیجئے۔

''موسم خزاں میں فیض کو اپنے گاؤں جانے ،

گاؤں والوں سے ملنے کا اور خود کی بنوائی مسجد میں نماز
ادا کرنے کا اشتیاق ہوا۔ کالا قادر سے لاہور لوٹنے
کے بعد طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر کے
مشورے پر گھر والے ان کو اسپتال لے گئے۔ ہسپتال
سے فیض گھر نہیں لوٹے۔ ۲۰ رنومبر کو دوپہر کے وقت
فیض صاحب وفات پا گئے۔''

فیض کی وفات پر ساری دنیا میں غم منایا گیا۔ بعد کے مجموعے ان کے دوستوں نے ترتیب دے کر شائع کئے۔ (غبار ایام) کلام بکھرا پڑا تھا۔ بقول مصنفہ........ ''فیض صاحب نہ تو سگریٹ کا کبھی حساب کتاب رکھتے تھے نہ ہی اشعار کے........'' بعد کے کلام کے بارے میں مصنفہ کی رائے ہے کہ

''بعد کی تخلیقات جو فیض کے مجموعۂ کلام نسخہ ہائے
وفا میں غبار ایام کے عنوان سے باب میں جمع ہیں مرے
دل مرے مسافر کے ضمیمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا بھی
شمار فیض کے آخری دور کے کلام میں ہوتا ہے۔ اس میں
فیض کے خیالی پیکروں اور شعری ترکیبوں کا جو سلسلہ ہے
وہ ابتدائی زمانے کی شاعری سے چلا آرہا ہے لیکن اب
شاعری کی مجموعی تصویر میں گہرے رنگوں نے بہت زیادہ
جگہ گھیر لی ہے۔ بالفاظ دیگر فیض کے آخری برسوں کے
کلام پر نظر ڈالنے پر ناگزیر طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ اس
دور کی نظموں اور غزلوں کی جو بنیادی کیفیت ہے وہ اُس
ہلکی اور مبہم سی اُداسی سے قطعی الگ ہے جو نقشِ فریادی
کے اور اس کے بعد کے برسوں کے متعدد رومانی اشعار کی
خصوصیت ہے۔ یہ پچھلے زمانے کی سماجی و سیاسی نظموں

میں سوز وطن کی اس کیفیت سے بھی الگ ہے جسے کوئی
انسانی کیفیت نہیں بلکہ پورے دور کا رشتہ سمجھنا چاہئے۔''
اور کتاب ختم ہوتی ہے ان جملوں پر ـــــــ

''فیض احمد فیض کی شاعری کی دلفریب ہم آہنگی، نغمگی، نہایت حسین اور نفیس شعری پیکروں کا سلسلہ اور دوسرے منفرد محاسن اُس عظیم انسان دوستی، ہمدردی، امید پسندی اور امید افزائی۔ ہر زمانے میں اس کی ضرورت اور مقبولیت کی ضمانت رہیں گی۔ فیض احمد فیض کا انسانیت پر اور زندگی کی دائمی قدروں پر یقین و اعتماد بھی متزلزل نہیں ہوا۔ ان کے آخری برسوں کی غمگین گھڑیوں میں بھی ان کی شاعری میں انسان دوستی اور ہمدردی کے۔ امید اور محبت کے سُر صاف سنائی دیتے ہیں اور وہ ہر زمانے میں ہر ملک کے رہنے والوں کے لیے قابلِ فہم اور عزیز ثابت ہوں گے۔

باقی ہے کوئی جو ساتھ تو بس ایک اسی کا
پہلو میں لیے پھرتے ہیں جو درد کسی کا
اک عمر سے اس دُھن میں کہ اُبھرے کوئی خورشید
بیٹھے ہیں سہلا لئے شمعِ سحری کا

× × ×

نہایت عرق ریزی اور ژرف نگاہی کے ساتھ لکھی گئی یہ کتاب فیض کی شخصیت و شاعری، اس کے پیچ وخم اور کیف وکم سے متعلق تاریخی اور دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنفہ نے جو خود فیض کے قریب رہی ہیں کہیں بھی قربت اور عقیدت کا بیجا استعمال نہیں کیا۔ ایک معروضیت، حقیقت اور تلاش وتوازن پوری کتاب میں یکساں طور پر نظر آتا ہے ـــــ ہر چند کہ اس میں فیض کی رومانیت اور انقلابیت کے بارے میں بحثیں نسبتاً کم ہیں۔ ان کے تصور انقلاب کے بارے میں بھی گفتگو نہیں کی گئی ہے یا ان کے شعری تصورات اور میزان کے مقالات پر بھی

گفتگو نہیں کی گئی ہے اور کسی ایک کتاب میں سب کچھ سمیٹ لینا ممکن بھی نہیں ہوا کرتا لیکن ان کی اشتراکی اور انقلابی شاعری جو اکثر بحث میں رہتی ہے جسے سردار جعفری نے بھی اُٹھایا اور بعض دوسروں نے بھی یہ بحث ضروری تھی تاہم فیض کے دیگر بے شمار پہلوؤں کو احاطہ کرنے والی یہ کتاب فیض کی زندگی، جدوجہد، شاعری اس کی جہت و برت کو بیحد تفصیل سے پیش کرتی ہے۔ اس انداز و اسلوب سے اردو میں کوئی کتاب فیض پر لکھی گئی ہو میرے علم میں نہیں۔

اس کتاب میں بقول جمیل جالبی بہت سی ایسی باتیں آ گئی ہیں جو اردو قارئین کے لئے بالکل نئی ہیں۔ انداز بھی اچھوتا ہے......ایماندارانہ اور مفکرانہ۔

اس اہم اور یادگار کارنامے کے لئے میں لُدمیلا واسی لیوا کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

تقی عابدی کی فیض فہمی

جس طرح فیض صدی کے حوالے سے فیض کی شخصیت وشاعری کی دھوم ہے۔ کم وبیش اُسی انداز کی دھوم ہے فیض فہمی کی۔ فیض فہمی ایک عام سا لفظ ہے لیکن یہاں مُراد اس ضخیم اور وزن دار کتاب سے ہے جسے ترتیب دیا ہے ممتاز ومقبول ادیب ومحقق ڈاکٹر تقی عابدی نے اور جس کے چرچے ان دنوں مغرب سے مشرق تک پھیلے ہوئے ہیں۔ تقی عابدی جو بھی کام کرتے ہیں، جس کام میں ہاتھ لگاتے ہیں اس کی جڑ تک پہنچتے ہیں۔ شاخوں کو کھنگالتے ہیں اور ایک ایک پھول پھل کا حساب لگا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کے تحقیقی ذہن اور ادبی وژن کا اندازہ لگتا ہے۔ اب تک انھوں نے جتنے بھی کام کئے ہیں وہ تحقیقی نوعیت کے زیادہ ہیں۔ تحقیق کے لیے جس طرح سے کتب خانوں، سرمایوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ ٹورنٹو جیسے مغربی شہر میں ممکن ومُیسّر نہیں۔ اس کے لیے وہ جس طرح ملک بہ ملک' شہر بہ شہر آتے جاتے وہاں کے کتب خانوں، عالموں، بزرگوں سے رابطہ کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں اس کی مثال اس دور میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتی' جس انداز سے وہ

کام کرر ہے ہیں اور لگا تار کتابیں آ رہی ہیں اس سے نہ صرف تحقیق بلکہ تحقیق کے طریقۂ کار کی ایک نئی راہ نکلتی دکھائی دیتی ہے۔ تحقیق کے لیے جس لگن، جستجو اور جنون کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ وہ سب کہ سب تقی عابدی میں موجود ہے۔ دیکھتے دیکھتے ان کا گھر کتب خانہ بلکہ ان کا ذہن خزانہ بن گیا ہے جسے وہ فراخدلی سے لٹاتے بھی رہتے ہیں۔

فیض فہمی تقی عابدی کی تازہ ترین کوشش ہے جسے صد فی صد تحقیقی کام نہیں کہا جا سکتا۔ فیض ماضی قریب کے شاعر ہیں اور تحقیق کا تعلق عموماً ضی بعید سے ہوا کرتا ہے۔ اسی لئے اس کتاب میں تحقیق کے علاوہ تنقید بھی ہے۔ پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''فیض کی سوسالہ سالگرہ کے موقع پر فیض فہمی پر یہ دستاویز اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تصنیف و تالیف کی گئی ہے تا کہ فیض کی حیات اور شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی اقدار کا ہر زاویۂ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ فیض کی حیات اور شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ ان کی شاعری کی طرز فغاں اور ان کی نثر کی طرز بیاں پر سیر حاصل کام نہ ہو سکا بلکہ کچھ قدیم تنقیدی، تشریحی، تفسیریں اور تجلیلی تحریریں تکراری صورت میں شائع ہوتی رہیں۔ اس کتاب میں حتی المقدور اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

فیض فہمی تقریباً چودہ سو صفحات پر مشتمل ایک بیحد ضخیم کتاب ہے۔ غیر

معمول ضخامت اس لیے ہوئی کہ اس میں اگر ایک طرف خود تقی عابدی کے چالیس سے بھی زیادہ مضامین ہیں تو دوسری طرف دوسرے ادیبوں و نقادوں کے سو سے بھی زیادہ مضامین ہیں۔ فیض اور ان کے بیوی، بچوں کے بھی مضامین شامل ہیں۔ جس کتاب میں تقریباً ڈیڑھ سو سے بھی زیادہ مضامین شامل ہوں۔ اسے غیر معمولی طور پر ضخیم تو ہونا ہی تھا۔ مقدار اور معیار کے حوالے سے خود تقی عابدی کے اتنے اور ایسے مضامین ہیں کہ وہ اسے اپنی ایک ذاتی کتاب بنا سکتے تھے اور مصنف کہلائے جا سکتے تھے۔ اب اس صورت میں وہ مرتب ہی کہلائے جائیں گے۔ پھر دوسرے ادیبوں کے جو مضامین انھوں نے شامل کئے ہیں ہر چند کہ وہ بیحد اہم اور قیمتی ہیں (کچھ غیر اہم بھی ہیں) تاہم ان میں سے زیادہ تر آسانی سے دستیاب ہیں۔ اس کی وضاحت پیشِ لفظ میں یوں کرتے ہیں ۔

> '' ہمارا مقصد چوں کہ ایک مستند دستاویز کی تصنیف اور تالیف ہے اس لئے درجنوں جدید مضامین کے علاوہ اس میں ان تمام مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے جن سے عامی اور عالم دونوں مستفید ہو سکیں اور یہ کتاب مصنفین ، محققین اور اسکالرز کے لیے سودمند اور مددگار بن سکے۔ ہم نے دانستہ طور پر ان مضامین کو شامل نہیں کیا جن میں گذشتہ قدیم مطبوعہ مقالوں اور مضامین کے بہت سے حصّوں کو قینچی اور گوند کی مدد سے کسی حوالے کے بغیر پیش گیا تھا۔ ہمیں تکرار اور مضمون نگار کی تحقیر گوارا نہ تھی۔''

یہ کہہ پانا مشکل ہے کہ ان شامل شدہ مضامین میں تکرار اور خود شناسی نہیں ملتی۔ کہیں کہیں ترتیب پر بھی حیرت ہوتی ہے لیکن یہ معمولی باتیں ہیں کہ

اتنے مضامین کی بھیڑ اور غیر معمولی طور پر مواد کی فراہمی و یکجائی کبھی کبھی ترتیب و تنظیم کو بہر حال متاثر کرتی ہے۔

اب میں براہ راست صرف تقی عابدی کے مضامین پر مختصراً کچھ عرض کروں گا۔ تقی عابدی نے پہلے فیض کا زندگی نامہ پیش کیا ہے جو ضروری تھا۔ اس مضمون میں فیض کی زندگی واقعات اور حادثات سے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں و ترتیب کے ساتھ محنت سے پیش کی گئی ہیں جو تقریباً چھبیس صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد فیض کی بے شمار و یادگار تصویریں ہیں۔

''فیض کی شاعری'' کے عنوان سے تقی عابدی کا ایک طویل مضمون ہے جو مثالوں اور حوالوں کے ذریعہ فیض کی شاعری کو سمجھنے کی اچھی کوشش ہے۔ اس مضمون میں ایک جگہ اچھی بات لکھی ہے۔

> ''فیض نے زندگی کے فلسفہ پر نہیں بلکہ زندگی
> کے مسائل پر گفتگو کی ہے ان کی شاعری میں
> زندگی کی شمع کی تو حسرت اور شکست سے نہیں بلکہ
> عزم اور آرزو سے بلند ہے جس میں جمال اور
> رومانی قدروں کو اہمیت اس لیے بھی دی گئی ہے
> کہ وہ حقیقت نگاری کی ضامن ہیں۔''

اس مضمون میں کچھ غور طلب اور بحث طلب باتیں بھی اُٹھ گئی ہیں جس کی وجہ سے یہ مضمون تحقیق کے بجائے تنقید کی حد میں داخل ہو گیا ہے یہ اچھی بات ہے۔ اسی طرح ان کا مضمون ''فیض کی غزل'' بھی عمدہ مضمون ہے جو شروع تو ہوتا ہے تحقیقی انداز سے لیکن آگے چل کر وہ بھی تنقیدی رُخ اختیار کر لیتا ہے لیکن مثالوں کی کثرت سے تنقید کی جہت قدرے اِدھر اُدھر ہو جاتی ہے۔ مضمون ختم ہوتا ہے ان جملوں پر۔

> ''فیض نے غزل کو دوسرے ترقی پسند شعراً کی

> طرح متروک اور مسترد نہیں کیا بلکہ اسے نیا شگفتہ
> لہجہ دے کر عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا
> جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیض کی شاعری نظم کی طرح
> غزل بھی بڑی دلکش اور جاندار نمایاں ہوگئی۔ فیض
> کے لہجہ نے انسانی ذہن اور تہذیب و طریق
> شاعری میں جدید راہیں روشن کی ہیں۔''

اسی طرح انھوں نے فیض کی شاعری میں عربی و فارسی تراکیب کے حوالے سے بھی ایک مضمون قلمبند کیا ہے۔ عابدی صاحب نے فیض کی نظموں پر بھی کئی مضامین لکھے ہیں۔ ''فیض کی نظم کی وسعتیں'' اس ضمن میں پہلا مضمون ہے۔ فیض کی نظم کے بارے میں ان کا پہلا تاثر تو یہ ہے کہ یہ عنوان دار غزل معلوم ہوتی ہیں اور یہ بھی'' ہم اور دوسرے ادیب و نقاد آج تک اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ فیض کی غزل نظم سے بہتر ہے یا نظم غزل سے ____''

اس مضمون میں اقبال پر فیض کی پہلی نظم کا ذکر بطور خاص ہے جو اقبال کی زندگی میں ۱۹۳۱ء میں کہی گئی تھی۔ پوری نظم بھی پیش کی گئی ہے۔ بول زنداں کی ایک شام وغیرہ کے ذریعہ علامت اشاریت امیجری وغیرہ پر تو باتیں کی گئی ہیں جہاں موضوع کی طرف آتے ہیں نعرہ اور پروپگنڈہ سے متعلق بحث طلب باتیں اُٹھ جاتی ہیں پھر فیض کا بیان، مسعود حسین خاں کا بیان اور پھر خود مصنف کا بیان، مثالیں اور حوالے یہاں بھی زیادہ ہیں۔ تنقید کا فکری عمل بذات خود ایک تخلیقی عمل ہوتا ہے اسی لئے کیپلنگ نے کہا تھا تنقید تخلیق در تخلیق ہے۔ اگلا مضمون کلام ''فیض پر فیض کار'' یو یو ہے جس میں فیض کے مکالمے ہیں۔ خطوط کے اقتباسات ہیں۔ اس میں بس ترتیب ہے تنقید نہیں۔ فیض کی دولت تنہائی میں تنہائی کو صحت منداور خوشگوار خمار خلوت کہا گیا ہے۔ ایک ایسی خلوت جس میں جلوت پوشیدہ ہے ان کی شہرۂ آفاق نظم تنہائی کا ذکر ہے۔ ایک مضمون میں قد و خال کے نقوش پیش کئے گئے ہیں۔

لب ورخسار، قد وقامت پر گفتگو ہے لیکن محققانہ انداز ہیں۔ فیض اوراختر شیرانی کی مشترکہ قدروں کی تلاش میں بھی تحقیق کا انداز زیادہ۔ یہ جملہ اچھا ہے۔ ''اختر شیرانی کے ساتھ نہ عمر نے وفا کی نہ اردو تنقید نے وفا کی۔'' دونوں کا تقابل لیکن مقصد لہجہ کا تاثر اور تسلسل کا سُراغ پانا ہے۔ یہ مضمون عمدہ اور معنی خیز ہے لیکن اور عمدہ ہوسکتا تھا اگر مزید تفصیل اور گہرائی میں جایا جاتا۔ اختر شیرانی سے نہ صرف فیض بلکہ مجاز، سردار وغیرہ بھی متاثر تھے جیسے اختر شیرانی کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ویسے ہی ترقی پسند شعرأ پر اختر کے اثرات پر گفتگو نہیں ہوسکی ہے۔ جس کی ابتدا تقی عابدی نے کردی ضرورت ہے اس گفتگو کو آگے بڑھایا جائے۔

ایک اور دلچسپ مضمون ہے کون بڑا ''جوش یا فیض'' ؟

اردو شاعری میں تقابل کی روایت، بیسویں صدی میں اقبال کے بعد کون بڑا شاعر جوش یا فیض اچھی تمہید اور عمدہ گفتگو سے مضمون کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد یہ جملہ ـــــ ''ہر مشہور شاعر بڑا نہیں ہوتا اور ہر بڑا شاعر مشہور نہیں ہوتا ـــــ'' پھر تقابل کا یہ خوبصورت انداز ـــــ

''فیض خاموش اور ساکت تو جوش بُلبل زبان
اور پُر گفتار، فیض نرم خو اور دھیمے لہجہ کے مالک تو
جوش گرم خو اور جوش وخروش کا پیکر۔ فیض منکسر
المزاج اور خاکسار تو جوش جلال مزاج اور انانیت
کا خالق اگر چہ دونوں پٹھان دونوں حُسن کے اسیر
اور دونوں دخترِ رز کے عاشق۔''

شخصی تقابل تو دلچسپ ہے لیکن حب ۴۵ء میں فیض جوش کی انقلابی شاعری پر مضمون لکھتے ہیں تو صاف کہتے ہیں کہ انقلابی شاعری وہی ہے جو اشترا کی عقائد کے مطابق ہے۔ ''لیکن جوش کے ساتھ ایسا نہیں ہے حالانکہ وہ ''حسین اور انقلاب'' جیسا مرثیہ بھی کہتے ہیں جس کا اشتراکیت سے لینا دینا نہیں ہے۔ مصنف نے

دبے لفظوں میں فیض کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے۔ ان امور پر عابدی صاحب نے فکر انگیز گفتگو کی ہے اور بعد میں یہ نتیجہ برآمد کیا ہے ۔

''بیسویں صدی میں اقبال کے بعد سب سے
بڑے شاعر ہونے کا تاج اگر کسی کے سر پر سجتا ہے تو
وہ شاعر فیض احمد فیض ہیں نہ کہ جوش ملیح آبادی۔''

لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا ___ ''جوش اور فیض دونوں بڑے شاعر ہیں۔ دو[illegible]ں کا لہجہ مخصوص ہے وہ ایک دوسرے کے مقلد نہیں'' ___ آخری سطروں میں جوش کی تعریف کی ہے لیکن فیصلہ تو درمیانی سطروں میں آچکا۔ لیکن یہ فیصلہ مصنف کا ذاتی ہے اور یہ بھی کہ ادب میں رائے ہوتی ہے فیصلہ نہیں۔ اس خیال سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن مضمون کے عمدہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

ایک چھوٹا سا مضمون اور ہے ''فیض اور بادہ و ساغر'' یہ موضوع اردو شاعری کے لیے نیا نہیں ہے لیکن [illegible]ں نے ان میں نئے معنی دیے۔ مضمون مختصر ہے لیکن جامع اور دلچسپ۔ ''فیض کے کلام میں غلطیاں اور اسقام۔'' بڑے سے بڑے شعراً کے یہاں بھی زبان و بیان کی غلطیاں ہوا کرتی ہیں بڑی محنت [illegible]وں کو تلاش کیا اور ترتیب دیا۔ طویل مضمون ہے آخر میں یہ جملہ بھی ۔

'' اخیر میں ہم یہی کہیں گے کہ فیض ایک
بڑے شاعر تھے لیکن عظیم شاعر نہ تھے جن سے کوئی
دبستان منسوب ہو۔''

فیض نے خود بھی اپنے آپ کو کبھی عظیم شاعر نہیں کہا اور شاید اب تک کسی نقاد نے بھی نہیں۔ یہ مضمون بھی بہت محنت سے لکھا گیا ہے جو بحث کے دروازے بھی کھولتا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے فیض کے انٹرویوز ترتیب دیے ہیں۔ اٹھائیس اشخاص چار سو پچاس سوالات پر مشتمل انٹرویوز جو بھی ۵۴۸ سے لے کر ۶۵۳ تک پھیلے ہوئے ہیں جو فیض فہمی کو حجمی کرتے ہیں زخمی بھی۔

فیض کی تقریظیں کے عنوان سے تقریباً ۳۵ صفحات میں فیض کی وہ تحریریں ہیں جو بطور پیش لفظ اپنی کتابوں یا دوسری کتابوں کے بارے میں لکھی ہیں جسے عابدی صاحب نے بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔

پھر فیض کے معرکتہ لآرا مضامین ۔ ادب کا ترقی پسند نظریہ۔ جوش شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے ۔ کچھ اور تحریریں ،تقریریں، وہ یادگار تقریر بھی جو لینن انعام حاصل کرتے وقت دی ۔ اسی تسلسل میں اقبال کی پیام مشرق کا منظوم ترجمہ جسے فیض نے کیا ہے ۔ ابتداً تعارف اس کے بعد اصل متن کے ساتھ ترجمہ۔ ساڑھے تین صفحات پر مشتمل تعارف بیحد عمدہ ہے جو اپنے آپ میں ایک مکمل مضمون ہے۔ وہ گفتگو بھی شامل ہے جو پریم چند سے متعلق کی گئی جس میں پریم چند کی حقیقت نگاری پر اسی انداز میں گفتگو کی گئی ہے جیسے جوش کی انقلابی شاعری کے بارے میں۔ دونوں گفتگو یا خیالات غور طلب ہیں اور بحث طلب بھی ـــــــ یوں تو فیض کوئی باضابطہ نقاد تو نہ تھے لیکن مفکر و دانشور بہر حال تھے اس لیے ۔ ان کے خیالات سے اختلافات کیا جا سکتا ہے لیکن صرف نظر نہیں ۔

فیض کے عقائد سے متعلق بھی ایک مضمون ہے جس میں مضمون کے اظہارات و خیالات زیادہ ہیں ۔ فیض کے خطوط کی روشنی میں مصنف نے فیض کی صحت اور بیماریوں پر بھی ایک مختصر سا مضمون لکھا ہے جو خاصا دلچسپ ہے جس میں مصنف کا شغل و پیشہ دونوں ہی بولتے نظر آتے ہیں ۔ اس کے علاوہ فیض کے خطوط پر ایک مکمل تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے اور پھر سوال ہے۔ ''فیض کے خطوط سے ہمیں کیا ملا؟'' خطوط کی تعداد، تقسیم، مکتوب، مکتوب الیہ اور یہ کارآمد جملہ ـــــ ''فیض کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے ایلس کو لکھے گئے خطوط مددگار ثابت ہوئے اگرچہ ان خطوں میں پیار و محبت، گھر بار کے مسائل اور واقعات کا ذکر ہے لیکن مسئلہ زندگی، فلسفہ، زندگی، حیات کے تصورت کے علاوہ شاعری، مطالعہ، خود شناسی، تنہائی خوش اُداسی، مجلسی اور کائناتی مطالعہ پر مختصر مگر عمدہ نکات موجود ہیں ۔''

یہ بات درست تو ہے لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ خط کچھ ہوتے ہیں اور شاعری کچھ اور۔ شاعری کا تعلق تخیل و وجدان سے ہوا کرتا ہے اور گفتگو کا تعلق حقائق زمانہ سے۔ فنکار کی گفتگو کبھی کبھی گمراہ کن بھی ہوتی ہے۔ اس لئے خطوں و انٹرویوز کے ذریعہ شخصی واقعات عوامل و محرکات سمجھنے میں تو آسانی ہو سکتی ہے شاعری میں نہیں لیکن پھر بھی ان خطوں کی اہمیت ہوتی ہے کہ یہ شاعر و فنکار کے ہیں۔ ان خطوں کے ذریعہ خود مصنف نے شاعر کے بارے میں کیا رائے قائم کی اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔

تقی عابدی کا ایک اور عمدہ مضمون ہے ''فیض اور مصطفیٰ زیدی''۔ زیدی فیض سے تقریباً اکیس سال چھوٹے تھے اور ہر اعتبار سے چھوٹے تھے۔ پھر تقابل کیوں؟ جواب میں یہ تحریر ہو سکتی ہے ____ ''مصطفیٰ زیدی کے فکر اور فیض کے تخلیقی فکر میں ہم آہنگی ہے۔'' پھر کچھ اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ زیدی نے خود ابتداً فراق اور بعد میں جوش کا اثر قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ فیض کا کہیں بھی ذکر نہیں۔ عین ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر اثر قبول کیا ہو کہ وہ عہد ہی نئی قسم کی رومانیت میں شرابور تھا۔ حسرت موہانی اور اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا طوطی بول رہا تھا اور ایک نئی رومانوی حقیقت بال و پر کھول رہی تھی اور سارے شعراً اس کی گرفت میں تھے۔ عابدی نے ایک بات بڑے پتے کی کہی ہے ____ ''فکری اور تخلیقی لحاظ سے اگر ہم مصطفیٰ زیدی کو جوش اور فیض کے درمیان کی کڑی کہیں تو غلط نہ ہوگا ____'' حالانکہ کسی کو اسی بات پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ جو شاعر جوش اور فیض سے کافی چھوٹا ہے کم عمر ہے وہ دونوں کے درمیان کی کڑی کیسے ہو سکتا ہے۔

چند چھوٹے چھوٹے مضامین اور ہیں۔ فیض اور نوبل پرائز، فیض بنام افتخار عارف۔ قصہ سازشِ اغیار، مرثیۂ امام حسین، فیض نے کن کن کتابوں کا مطالعہ کیا۔ فیض کے بہتر نشتر فیض کے لطیفے۔ فیض کی نعت، فیض اور ایرانی انقلاب، فیض کا غیر مدوّن کلام وغیرہ۔ ان میں زیادہ تر مضامین واقعاتی اور اطلاعاتی ہیں

البتہ مرثیہ امام حسین اور فیض اور ایرانی انقلاب عمدہ مضامین کہ یہ تقی عابدی کے پسندیدہ موضوعات ہیں اس پر ان کا ذہن اور قلم خوب چلا ہے جہاں وہ بالکل نئے انداز سے نئے فیض کو متعارف کراتے ہیں۔ بقیہ میں عابدی کا محققانہ ذہن، تلاش و جستجو، اعداد و شمار، فراہمی مواد وغیرہ میں غیر معمولی محنت وریاضت دکھائی دیتی ہے ۔کتاب کے آخر میں فیض کا غیر مدوّن کلام کو یکجا کر کے بھی ایک بڑا کام کیا ہے۔

بلا شک و شبہہ یہ کام غیر معمولی محنت و مشقت کا ہے جسے تقی عابدی ہی انجام دے سکتے تھے وہ اگر پاکستان میں ہوتے تو شاید اتنی حیرت نہ ہوتی لیکن ٹورنٹو (کینڈا) میں رہتے ہوئے مواد و وسائل کی کمی کے باوجود اتنا بڑا کام کر پانا عابدی صاحب کے دم خم پر منحصر ہے وہ جنونی انسان ہیں جس کام میں ہاتھ لگاتے ہیں اسے بہ حسن وخوبی انجام دیتے ہیں خواہ اس میں کتنی دشواریاں اور رُکاوٹیں ہوں۔ کتاب کی اشاعت میں بھی جو نفاست محنت اور دبازت ہے وہ ان کے کام کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ میں صمیمِ قلب سے ان کے اس گراں قدر کام کے لئے مبارک باد دیتا ہوں۔

فیض کا ایک اہم مضمون

یوں تو فیض دنیائے ادب میں بحیثیت شاعر تسلیم کئے گئے اور غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل کی لیکن اس غیر معمولی پن کے پیچھے ان کا شاعر ہونا کافی نہیں بلکہ ان کا مفکر اور دانشور ہونا بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ فیض ابتدا سے ہی سنجیدہ، خاموش طبع تو تھے ہی مطالعہ کے بھی شوقین تھے۔ شاعری کی ابتدا سے قبل ہی انھوں اردو انگریزی فکشن کا گہرا مطالعہ کرلیا تھا۔ عین نوجوانی میں سجاد ظہیر ورشید جہاں جیسے کامریڈ سے ملاقات کے بعد جس طرح سے انھوں نے مارکسزم اور سوشلزم کا مطالعہ کیا تھا اور اس سے متعلق اصول ونظریات کی جس نوع کی تفہیم کی تھی اور اپنے قلب وجگر میں اُتار لیا تھا وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے یہ قبولیت محض فیشن کے طور پر نہیں بلکہ فکر وفلسفہ کے حوالے سے منطقی اور استدلالی طور پر تھی۔ اپنی تہذیبی روایات اور شعری مزاج و مذاق کے احترام کے ساتھ ___ ان امور پر انھوں نے اس عہد میں کئی مضامین بھی لکھے اسی نوعیت کا ان کا ایک اہم مضمون ہے ___ ''ادب کا ترقی پسند نظریہ'' جو ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا تھا یعنی جس وقت فیض کی عمر محض ستائیس سال کی تھی اور ان کا کوئی شعری مجموعہ بھی منظر عام پر نہیں آیا تھا ___ اس عمر میں بھی فیض کی فکر میں جو

اعتماد اور ادب و تنقید سے متعلق جو رویہ و لہجہ ہے وہ ان کی ثابت قلمی و قدمی دونوں کو ظاہر کرتا ہے۔ مضمون کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

''رومانیت، واقعیت، رجائیت، قنوطیت ان سب کانٹوں سے ادبی مچھلیوں کا شکار کھیلا جا چکا ہے۔ آج کل ترقی پسند اور رجعت پسند کا چرچا ہے لیکن حسب معمول ابھی تک ان الفاظ کی بھی مکمل وضاحت نہیں ہوئی ہے جتنے منہ اتنی باتیں۔ مختلف اصحاب ترقی پسند ادب کے مختلف تصورات قائم کیے بیٹھے ہیں ____ اور اس کی حمایت پر کمر بستہ یا مخالفت میں شمشیر بدست نظر آتے ہیں۔''

اس کے بعد وہ ادب اور ترقی پسند ادب کو آسمان سے اُتری ہوئی چیز نہ بتا کر سامنے کی زندگی کلچر اور سماج سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ کلچر کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ____ ''کسی ملک یا کسی قوم کا کلچر اس کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر منحصر ہے۔'' یہی بات مارکس نے بھی کہی ہے ذرا بدلے ہوئے الفاظ میں جسے فیض آسان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ انداز مُدرسانہ ضرور ہے لیکن اس عہد میں یہ وضاحت و سراحت ضروری تھی کہ مطلع بہت صاف نہیں تھا۔ اسی لیے اور آگے وہ نہایت سادگی و سچائی سے کہتے ہیں۔

''ترقی پسند ادب کی تعریف کو ذرا وسعت دے سکتے ہیں اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند ادب ایسی تحریروں سے عبارت ہے جن سے سماج کے سیاسی اور اقتصادی ماحول میں ایسی ترغیبات پیدا ہوں جن سے کلچر ترقی کرے۔''

اور جو اس کی مخالفت کرے وہ رجعت پسند، فیض ترقی پسند نظریہ کو کلچر سے الگ کر کے نہیں دیکھ پاتے ہیں۔ کلچر کی مختلف تعریف کرے ہیں اور کئی مضامین بلکہ مکمل کتاب ہماری قومی ثقافت لکھتے ہیں۔ ذوالفقار بھٹو کے دورِ حکومت میں باقاعدہ

ثقافتی ادارے قائم کرتے ہیں اور تحقیقی منصوبے بناتے ہیں اور پوری ٹیم کلچر کے سُراغ میں لگ جاتی ہے۔ (ملاحظہ کیجئے ،عبدالروف ملک و احمد سلیم کی کتابیں) اس مضمون میں بھی وہ کلچر کی تعریف ، تقسیم وغیرہ پر بھی کھلی گفتگو کرتے ہیں اور واضح طور پر اپنا نظریہ بھی پیش کرتے چلتے ہیں ۔اسی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

"کلچر کی ترقی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ سماجی اقدار کی
ترتیب میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں اور ترقی پسند ادب وہ
ہے جو صحیح اقدار کا پرچار کرے کہ یہ اقدار اس وقت تک کلچر کا
مقصد نہیں بن سکتیں جب تک ان پر اجتماعی طور پر عمل نہ کیا
جائے اور ایسا عمل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک
سیاسی اور اقتصادی ماحول کو ان کے مطابق نہ بنایا جائے۔"

سیاسی اور اقتصادی ماحول ہی اصل وہ راستہ ہے جو اشتمالیت کی طرف لے جاتا ہے جسے پہلی بار مارکس نے انسانی اور سماجی فلسفہ کے طور پر پیش کیا اور ایک نئی سماجی ،تہذیبی اور اقتصادی حقیقت سامنے آئی کہ اس نوع کی جدلیات سے ہی سماجی نابرابری اور ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور کلچر متاثر ہوتا ہے اسی لئے فیض اپنے تمام تر نرم رویوں اور متوازن فکر کے باوجود کلچر کو سیاست سے الگ نہیں کر پاتے اور پورے مضمون میں کلچر کی تعریف اور سیاست و اقتصادیات سے اس کے رشتوں پر روشنائی خرچ کرتے چلے جاتے ہیں ۔اتنے کم وقت اور اتنی کم عمری میں فیض کی یہ سمجھ قابلِ قبول تو ہے ہی قابلِ داد بھی ہے۔ وہ کہیں بھی شدت اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی جارحانہ رویہ ___ بلکہ اُن کی تحریروں میں نظریہ و فلسفہ جھانکتا نظر آتا ہے۔علمی تبحر اور استدلال ___ جو مخالفین کو بھی قائل کر دیتا ہے۔ یہ فکر انگیز مضمون انھیں دلیلوں سے پُر ہے۔ جو ایک لمحے کے لئے ادب سے قدرے الگ سا معلوم ہوتا ہے۔فیض اس کا بھی جواب دیتے ہیں ___ اور کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں غیر ادبی ہیں اور ان کا ادب سے کیا لینا

دینا ــ لیکن وہ ان خارجی معاملات کو باطن سے رشتہ جوڑتے ہوئے ادب کی وسیع تعریف کرتے ہیں کہ سیاسی تقریریں اور صحافتی مضامین بھی ادب ہوتے ہیں لیکن انھیں پیش کرنے کا سلیقہ آنا چاہئے۔ اسی سلسلے میں وہ لکھتے ہیں ــــــ

''بعض اوقات سیاسی تقریریں اور صحافتی مضامین ادب کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں لیکن لکھنے والوں یا بولنے والوں کی بے احتیاطی۔ خامئی اظہار یا قلّتِ خلوص کی وجہ سے انھیں ادبی حیثیت نصیب نہیں ہوئی۔ اسی لیے ہم نے ترقی پسند ادب کی تعریف میں یہ بات شامل کرلی تھی کہ ترقی پسند ادب صرف ترقی پسند ہی نہیں ادب بھی ہے۔''

یہ باتیں بیحد اہم ہیں کہ ادب اگر فن ہے ہنر ہے تو اس کے فنی اقدار کا خیال ضروری ہے اس بات پر مارکس نے بھی زور دیا ہے کہ ادب پہلے ادب ہے۔ سنجیدہ و ذمہ دار ترقی پسند نقادوں نے بھی کبھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔ فیض نے بطور خاص۔ انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ترقی پسند شعرا مزدور کسان کی باتیں کرتے ہیں اکثر ان کی زبان اور اسلوب ایسا ہوتا ہے جو انسان کی فہم سے بالاتر ہوتا ہے تو اس کے لیے بھی فیض صاف طور پر کہتے ہیں کہ ــــ ''اگر ترقی پسند مصنفین کی آواز مزدوروں تک نہیں پہنچی تو نہیں پہنچے مجھ تک اور آپ تک تو پہنچتی ہے۔ ان کی تحریروں سے اتنا بھی ہوجائے کہ ہم اور آپ ان مسائل پر غور کرنا شروع کردیں تو یہی غنیمت ہے۔''

اور اس کے بعد یہ بلیغ جملہ بھی ــــ ''مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ صرف مزدور کی جنگ نہیں ہے ہم سب کی جنگ ہے۔ ہمارے دوست دشمن بھی مشترکہ ہیں۔ مزدور اور کسان کی بہبودی سماج کی اجتماعی بہبودی کے مترادف ہے۔'' جس زمانے میں یہ مضمون لکھا گیا فیض کے خیالات [illegible] لئے کہ کچھ تمامی قسم کے ترقی پسند نقادوں و شاعروں کا خیال تھا کہ موضوع کا راست۔ عام فہم

اور تمام آدمی تک پہنچنا ضروری ہے اور فیض نے اس سے الگ ہٹ کر بات کہی تھی ___ فیض کی نثر سے ہی نہیں نظم سے بھی اختلاف کیا گیا اور کمزور شاعری وجود میں آتی رہی ___ لیکن فیض نے اس وقت بھی بعد کے دور میں بھی ان امور سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اسی لئے مختلف رہے اور کبھی کبھی الگ تھلگ بھی۔ لیکن آج وقت نے فیصلہ کر دیا ہے کہ فیض کے خیالات کل بھی دُرست تھے اور آج بھی دُرست ہیں۔ اسی لئے مختصری سہی گفتگو کرنے کے لیے میں نے ان کے اسی مضمون کا انتخاب کیا جو کم عمری میں ضرور لکھا گیا لیکن جس کی دلیل آج بھی مکمل ہے مستحکم ہے۔

یہ مضمون فیض کی کتاب ''میزان'' میں سرِ فہرست شامل ہے۔ اور کئی رسائل وکتب میں شائع ہو چکا ہے۔ فیض کی شاعری فیض کی دانشوری اور ترقی پسند شخصیت کو سمجھنے کے لئے اسی مضمون کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ آگے چل کر جو مضامین انھوں نے جوش کے تصورِ انقلاب اور پریم چند کی حقیقت نگاری پر لکھے ہیں۔ وہ اکثر بحث طلب ہو گئے ہیں لیکن اس بنیادی مضمون کے مطالعہ کے بعد اگر فیض کے بعد کے یہ مضامین اور دیگر مضامین پڑھے جائیں تو بحث واختلاف کی گنجائش کم سے کم ہو جاتی ہے۔
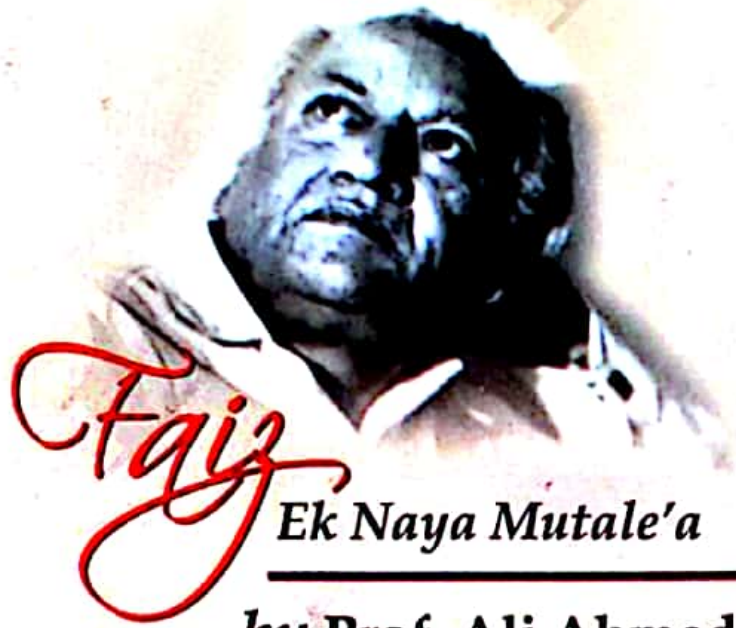
Faiz
Ek Naya Mutale'a
by Prof. Ali Ahmed Fatmi